# تعلیم و تربیت

مارچ 1993ء

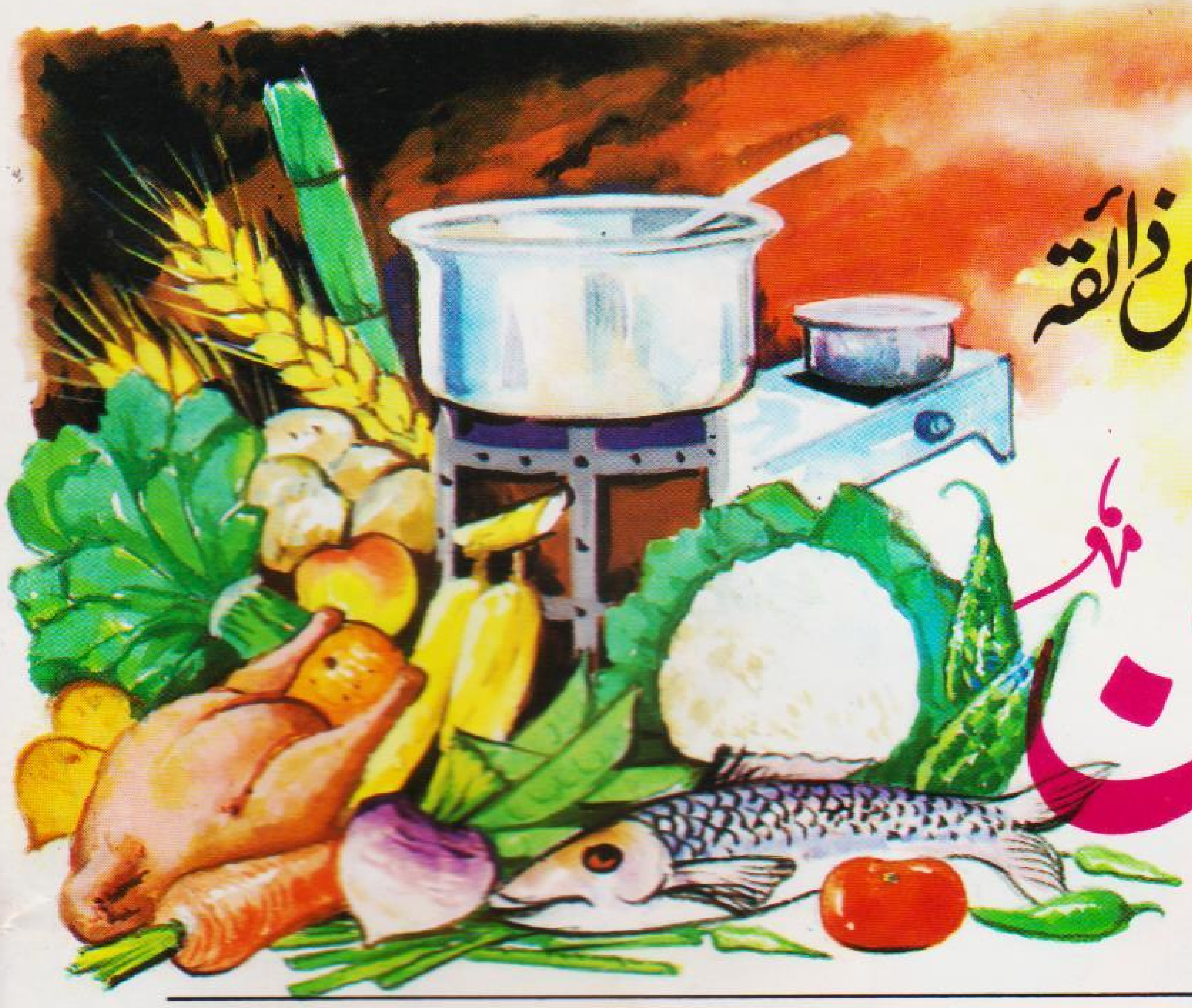

## قسم قسم کے لذیذ اور خوش ذائقہ

# پکوان

| | | |
|---|---|---|
| منوّر جہاں کا دسترخوان : | سستے اور پُرتکلف کھانے پکانے کی عام فہم ترکیبیں۔ | Rs. 30.00 |
| دیس دیس کے پکوان : | ایشیا، افریقہ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکا کے لذیذ پکوان۔ | Rs. 18.00 |
| صبیحہ کا دسترخوان : | کم فرصت خواتین کے لیے طرح طرح کے کھانے، پڈنگ، شربت، جام اور اچار۔ | Rs. 21.00 |
| چینی کھانے : | چینی کھانوں کے شائقین کے لیے لاجواب کتاب۔ | Rs. 21.00 |
| سبزیاں پکائیے : | سبزیاں پکانے کی ترکیبیں۔ یہ کتاب منوّر جہاں کے دسترخوان سے مرتّب کی گئی ہے۔ | Rs. 12.00 |
| گوشت پکائیے، مچھلی پکائیے : | گوشت اور مچھلی کے ہر قسم کے پکوان۔ یہ کتاب بھی منوّر جہاں کے دسترخوان سے مرتّب کی گئی ہے۔ | Rs. 20.00 |
| میٹھے پکوان : | حلوے، زردے، کھیر، سویاں، انگریزی پڈنگ اور دیسی مٹھائیاں بنانے کی آسان ترکیبیں۔ | Rs. 18.00 |

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

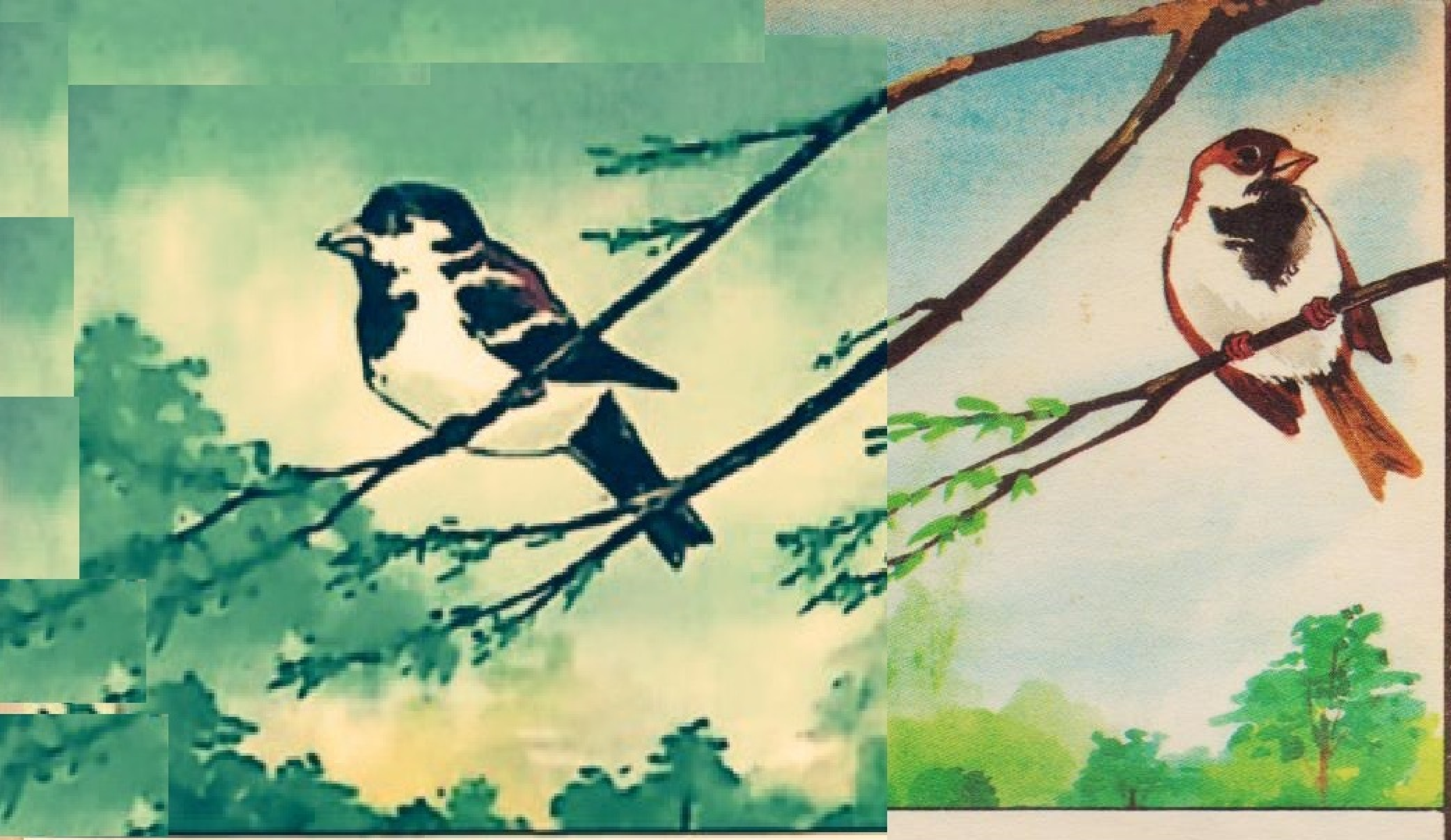

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

السّلامُ علیکُم

اِس مہینے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اِکٹھی تین خوشیاں عنایت کی ہیں۔ پہلی خوشی رَمضانُ المُبارک کی۔ آپ میں سے جن ساتھیوں پر روزے فرض ہیں، ہمیں اُمّید ہے کہ، وہ روزے رکھ رہے ہوں گے، اور جن پر ابھی روزے فرض نہیں ہوئے وہ رَمضان کا اِحترام کر رہے ہوں گے۔ رَمضان کا اِحترام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کُھلّم کُھلّا کھانے پینے سے پرہیز کریں۔ گھر اور گلی محلّے میں سکون اور امن و امان رکھیں۔ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے روزے داروں کو تکلیف پہنچے۔ اگر آپ نے اِس پر عمل کیا تو آپ کو اُتنا ہی ثواب ملے گا جتنا روزے داروں کو روزہ رکھنے سے ملتا ہے۔

دوسری خوشی یومِ پاکستان کی ہے، جو 23 مارچ کو تمام ملک میں جوش و خروش سے منایا جائے گا۔ یہ دن بھی ہم پاکستانیوں کے لیے بہُت اہم ہے، کیوں کہ اِسی دن مسلم لیگ نے قرار دادِ پاکستان منظور کی تھی، اور اِس کے نتیجے میں 14 اگست 1947 کو دُنیا میں ایک نیا اِسلامی ملک، پاکستان، وجود میں آیا تھا۔

تیسری خوشی عیدُالفطر کی ہے۔ جی ہاں، یہ خوشیوں بھرا تہوار بھی اِسی مہینے کی 25 تاریخ کو آرہا ہے۔ ہماری طرف سے پیشگی مُبارک باد قبول کیجیے۔

اور بھئی آخر میں یہ خوش خبری کہ مئی میں آپ کے تعلیم و تربیت کا سال نامہ شائع ہو رہا ہے۔ اِن شاء اللہ۔ اِس کے بارے میں ہم آپ کو اگلے مہینے تفصیل سے بتائیں گے۔

## اِس شمارے میں


| | | |
|---|---|---|
| اداریہ | ...... | 1 |
| آئی بہار (نظم) | حفیظ الرحمٰن احسن | 2 |
| برگد کا پیڑ (کہانی) | میرزا ادیب | 3 |
| چاند دیوتا کا مندر (کہانی) | محمد یونس حسرت | 7 |
| نیلی (کہانی) | سلیم خان گمی | 13 |
| ہم روزے کیوں رکھتے ہیں؟ | ڈاکٹر نصیر احمد ناصر | 17 |
| سائنس کے کھیل | | 19 |
| پیارے نبیؐ کے پیارے بچے بچیاں | ڈاکٹر عبدالرؤف | 20 |
| خوف کی وہ رات (کہانی) | رضوانہ سید علی | 21 |
| سکھی شہزادہ (کہانی) | آسکر وائلڈ | 24 |
| 23 مارچ (نظم) | ضیاء الحسن ضیا | 27 |
| جانور جو ناپید ہو گئے | | 28 |
| کوے (نظم) | خالد بزمی | 30 |
| کیا، کیوں، کیسے؟ | | 31 |
| سات سال کی جان (کہانی) | | 33 |
| دو دلچسپ کہانیاں | | 36 |
| داؤدی علمی آزمائش | | 37 |
| آپ کا خط ملا | | 39 |
| آیئے مسکرائیں | | 41 |
| آیئے، دوست بنائیں | | 42 |
| آپ بھی لکھیے | | 43 |
| سبز پانیوں کے شہر (کہانی) | فوزیہ طاہرہ | 48 |
| ہونہار مصور | | 55 |
| عظیم مسلمان | عین الحق فرید کوٹی | 56 |



52 واں سال

بارہواں شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبُوب رسالہ

چیف ایڈیٹر : عبدالسلام

ایڈیٹر : سعید لخت

آرٹ ڈائریکٹر : محمود حسن رومی

سرکولیشن اسسٹنٹ : محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر : ظہیر سلام
پرنٹر : عبدالسلام



پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
32- شارع بن بادیس لاہور
فون:- 361309-361310

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60- شاہراہ قائدِ اعظم لاہور



سالانہ قیمت
پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) -/200 روپے
مشرقِ وسطیٰ / افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/300 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) -/450 روپے
امریکہ / مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) -/450 روپے

مارچ
1993

قیمت فی پرچہ -/9 روپے

سرورق : آئی بہار

حفیظُ الرّحمٰن احسن

# آئی بہار

مچی دُھوم باغوں میں، آئی بہار
ہر ایک چیز پر آ گیا ہے نِکھار

سُنو تو ذرا بُلبلوں کی پُکار
ہیں اُن کے لبوں پر ترانے ہزار

وہ نغمے خوشی کے سُناتی ہیں کیا
رسیلے سُروں سے لُبھاتی ہیں کیا

اُڑانیں دِکھاتے ہیں سب جانور
اُڑاتے ہیں تانیں، پُھلاتے ہیں پر

سبھی مِل کے خوش خوش چہکنے لگے
چہکنے، مچلنے، لہکنے لگے

درختوں کی اپنی عجب شان ہے
نظر دیکھ کر اِن کو حیران ہے

چٹکتی ہیں کلیاں ہر اِک شاخ پر
ہیں غُنچوں کے جَم گھٹ، اِدھر اور اُدھر

اِدھر دیکھو پھولوں کی رنگیں قطار
اُدھر تِتلیوں کا نہیں ہے شُمار

نظر میں ہیں منظر سبھی شان دار
ہے جی میں، اِنہیں دیکھیے بار بار

کہیں موتیا ہے تو چمپا کہیں
کوئی پھول اِن جیسا دیکھا کہیں؟

یہ دیکھو، یہ پھولوں کا ہے بادشاہ
اِسے دیکھ کر لب پہ آتی ہے واہ!

جو نام اِس کا پوچھو، تو وہ ہے گلاب
غضب اِس کی خوش بُو، عجب آب وتاب

فَضا ہے حَسیں اور نِکھری ہُوئی
ہر اِک سَمت خوش بُو ہے بِکھری ہوئی

عجَب تازگی ہے، عجَب ہے سُرور
دِلوں پر بھی چھایا ہے خوشیوں کا نُور

ہے موسم سہانا، ہوا خوش گوار
حَسیں سب ہیں فِطرت کے نقش و نِگار

نِگاہوں سے پھولوں کا مُنہ چوم کر
کہے دل یہ، احسَن، مِرا جھوم کر

رہے یوں ہی اپنے وطن میں بہار
رہے مِہرباں ہم پہ پروردگار

# برگد کا پیڑ

میرزا ادیب

وہ ایک چھوٹی سی گلی تھی، جس میں گنتی کے سات مکان تھے۔ اِن میں سے چار مکانوں میں پانچ لڑکے رہتے تھے جن کے نام تھے ناصِر، باصِر، امجد، الطاف اور ارشد۔ ناصر اور باصر آپس میں بھائی تھے۔ باقی الگ الگ مکانوں میں رہتے تھے۔ اِن پانچوں کو ایک دوسرے سے بڑی مَحبّت تھی۔ جب اِسکول سے واپس آتے تو کھانا کھانے کے بعد اِسکول کا کام کرتے اور پھر آدھ میل دُور ایک باغ میں چلے جاتے اور شام تک وہاں کھیلتے رہتے۔ انہیں باغ کے ایک بہُت پُرانے برگد کے پیڑ سے بڑا پیار تھا۔ جب بھی اُس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تو اُنہیں بڑا لُطف آتا۔

برگد کا یہ پیڑ اِتنا پُرانا تھا کہ اِن لڑکوں کے دادا جان اور نانا جان بھی اپنے بچپن میں یہاں کھیلا کرتے تھے، اور یہ دادا جان اور نانا جان کہتے تھے کہ اُن کے اپنے دادا جان اور نانا جان بھی اِس پیڑ کا بڑی دِل چسپی سے ذکر کیا کرتے تھے۔

ایک روز کرنا خدا کا کیا ہُوا کہ یہ لڑکے شام کے قریب بڑے اِطمینان سے اُس پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے کہ ایک اُدھیڑ عُمر کا آدمی وہاں آیا اور ناصِر سے جو سب سے بڑا تھا، کہنے لگا۔

"لڑکے، ایک بات بتاؤ گے؟"

ناصِر نے ادب سے جواب دیا "جی ہاں، اگر وہ بات مُجھے معلوم ہوئی تو ضرور بتاؤں گا۔"

اجنبی نے کہا "تم سب یہیں رہتے ہو۔ یہاں کوئی ایسا آدمی بھی رہتا ہے جس کی عُمر بہُت زیادہ ہو، یعنی 70 کے قریب یا اِس سے بھی زیادہ۔"

لڑکے یہ سوال سُن کر ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ اُنہیں یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص بستی کے سب سے بوڑھے آدمی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے۔

وہ ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ کہنے لگا "یہاں کوئی ایسا بوڑھا نہیں ہے؟"

اب کے امجد نے جواب دیا "ہے، مگر آپ کیوں پوچھ

رہے ہیں؟ "

اجنبی بولا "بیٹا، اس سے کچھ پوچھنا ہے۔"

باصر کہنے لگا "دیکھیے جناب، ہماری گلی میں تو کوئی بڑی عُمر کا بوڑھا نہیں ہے۔ ایک تھا، وہ پچھلے مہینے مر گیا۔ البتّہ یہاں سے کچھ دُور دائیں طرف ایک پہاڑی ہے۔ اُس کے پیچھے جو آبادی ہے، وہاں کئی بُزرگ رہتے ہیں۔ آپ وہاں جائیں۔"

اجنبی جو اُن کے پاس بیٹھا بڑے غور سے باصر کی باتیں سُن رہا تھا، بولا "شکریہ، بیٹا۔ میں وہیں جاتا ہوں۔"

اور وہ چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد وہ پانچوں سوچنے لگے کہ یہ آدمی بوڑھے آدمی کا پتا کیوں پوچھ رہا ہے؟ اُس سے کیا کہنا چاہتا ہے؟

الطاف اور راشد کو امجد اور باصر سے یہ شکایت تھی کہ اُنھوں نے اجنبی سے یہ کیوں نہیں پُوچھا تھا کہ وہ ایسے بوڑھے شخص سے ملنا کیوں چاہتا ہے اور اُس سے کیا پوچھنا چاہتا ہے؟

"میں یہ کیسے پُوچھ سکتا تھا اُس سے؟" امجد نے کہا۔

"اور میں بھی ایسا سوال کیسے کر سکتا تھا؟" یہ لفظ باصر کے تھے۔

پانچوں کو یہ سوال نہ کرنے پر افسوس تھا۔ اُن کے ذہنوں میں ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

کئی دن بیت گئے۔ وہ اجنبی کو بھول چکے تھے کہ ایک شام اچانک، وہی اجنبی اُس وقت وہاں آیا جب وہ کھیل کود کے بعد اپنے گھروں کو جانے والے تھے۔

"ہیں! یہ تو وُہی ہے" امجد کے مُنہ سے نکلا۔

"کون وُہی؟" راشد نے پوچھا۔

"وہی، جو پچھلے ہفتے یہاں آیا تھا۔"

"ہاں، ہاں، یاد آ گیا" باصر نے اجنبی کو پہچان کر کہا "اِس نے ہم سے بستی کے سب سے بوڑھے آدمی کا پتا پوچھا تھا"

وہ سب اُٹھ کر اجنبی کے پاس گئے۔ اجنبی نے بھی اُنھیں پہچان لیا تھا۔

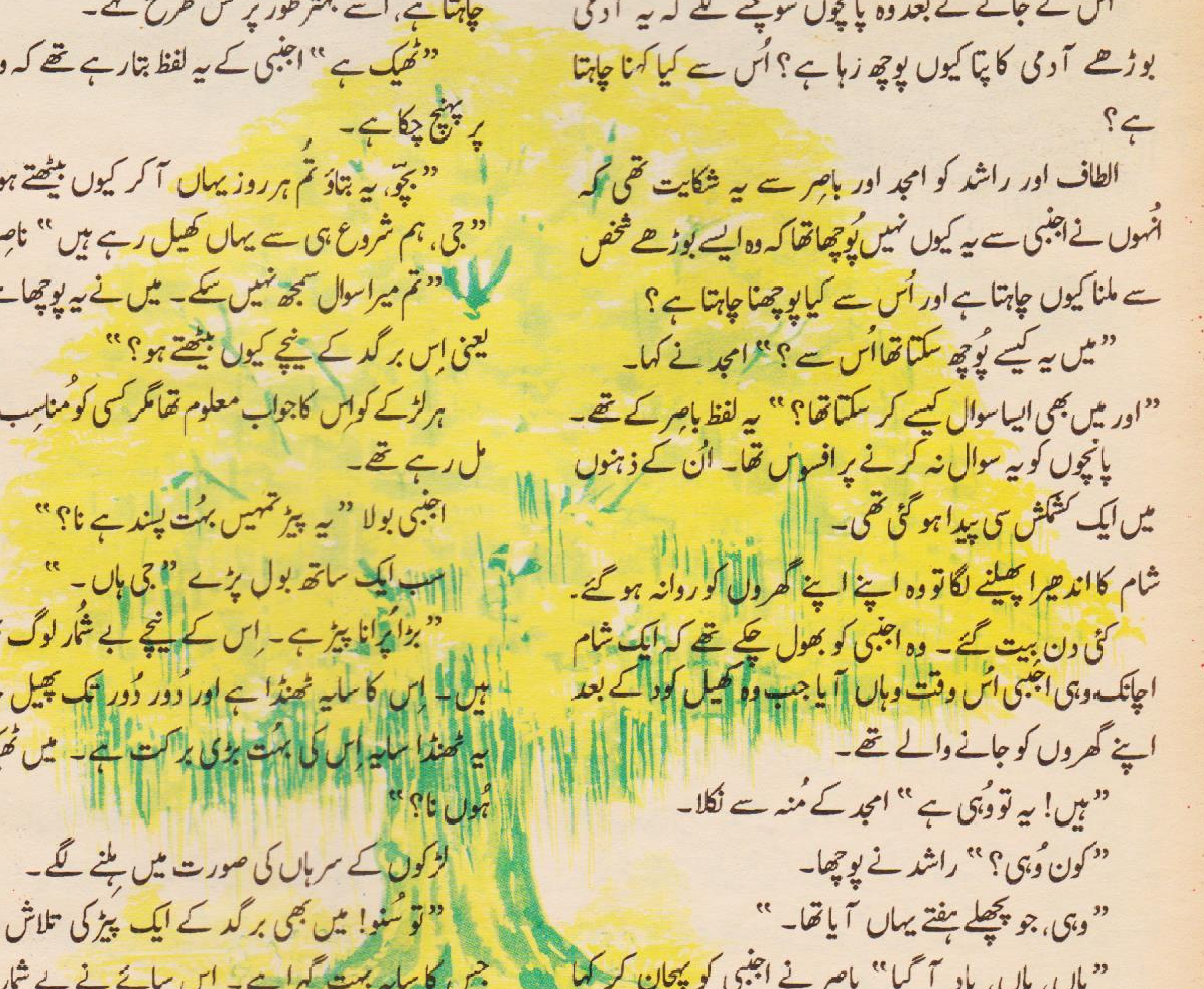

"خوش ہو نا بچّو؟" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ بہت خوش ہیں۔ جناب، ہم آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں" باصر نے کہا۔

"پوچھو، پوچھو؟ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اجنبی بولا۔

باصر نے کہا "جناب، ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ اُس بوڑھے آدمی سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"اچھا...... اچھا" اجنبی بولا "آؤ، وہاں جا کر بیٹھتے ہیں جہاں سے تم اُٹھ کر آئے ہو۔" وہ اجنبی کے ساتھ برگد کے پیڑ کے نیچے آ کر بیٹھ گئے اور بے چینی سے اُس کو دیکھنے لگے۔

اجنبی خاموش تھا۔ غالبًا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اُسے بہتر طور پر کس طرح کہے۔

"ٹھیک ہے" اجنبی کے یہ لفظ بتا رہے تھے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔

"بچّو، یہ بتاؤ تُم ہر روز یہاں آ کر کیوں بیٹھتے ہو؟"

"جی، ہم شروع ہی سے یہاں کھیل رہے ہیں" ناصر نے کہا۔

"تم میرا سوال سمجھ نہیں سکے۔ میں نے یہ پوچھا ہے کہ یہاں یعنی اِس برگد کے نیچے کیوں بیٹھتے ہو؟"

ہر لڑکے کو اِس کا جواب معلوم تھا مگر کسی کو مُناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

اجنبی بولا "یہ پیڑ تمھیں بہت پسند ہے نا؟"

سب ایک ساتھ بول پڑے "جی ہاں۔"

"بڑا پُرانا پیڑ ہے۔ اِس کے نیچے بے شُمار لوگ بیٹھتے رہے ہیں۔ اِس کا سایہ ٹھنڈا ہے اور دُور دُور تک پھیل جاتا ہے۔ یہ ٹھنڈا سایہ اِس کی بہت بڑی برکت ہے۔ میں ٹھیک کہ رہا ہُوں نا؟"

لڑکوں کے سر ہاں کی صورت میں ہلنے لگے۔

"تو سُنو! میں بھی برگد کے ایک پیڑ کی تلاش میں ہوں جس کا سایہ بہت گہرا ہے۔ اس سائے نے بے شمار لوگوں پر اپنی برکت نچھاور کی ہے۔ میں نے سوچا تھا شاید کوئی بوڑھا مجھے اُس برگد کے پیڑ کا پتا بتا دے گا، مگر نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ کسی بوڑھے کو اُس کا پتا معلوم نہیں ہے۔ جن کو معلوم تھا وہ مر کھپ

گئے ہیں۔ شاید کسی دوسری بستی یا گاؤں میں کوئی ایسا بوڑھا مِل جائے۔"

لڑکے یہ سُن کر پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوئے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اجنبی سے اب کیا پوچھیں اور کیسے پوچھیں۔

کئی لمحے گُزر گئے۔ لڑکے بہُت کچھ سوچنے کے باوجود اجنبی سے نہ تو کچھ کہہ سکے اور نہ پُوچھ سکے۔

"لو بھئی، اب میں چلتا ہوں" اجنبی اُٹھ بیٹھا۔

وہ بھی اُٹھ بیٹھے۔ ابھی تک وہ خاموش تھے۔

اجنبی اُن کے دل کی بات سمجھ چکا تھا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا "میری تلاش جاری ہے۔ جب میں اپنے مقصد میں کام یاب ہو گیا تو ضرور تم لوگوں کو بتا دوں گا۔ اب خدا حافِظ" اور وہ اُنہیں کشمکش کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔

اُنہوں نے چاہا کہ کسی اور موضوع پر گُفت گُو کریں، کوئی اور بات سوچیں، گھر کی یا اِسکول کی باتیں کریں مگر جب بھی ایسی کوشش کرتے تو اُس اجنبی کا خیال آ جاتا جو اُنہیں چند مِنٹ پہلے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ گھر آئے تو ہر ایک نے گھر کے کسی بڑے آدمی سے سوال کیا:

"وہ کہتا تھا برگد کا ایک بہُت ہی پُرانا پیڑ ہے۔"

"ہو گا، ضرور ہو گا۔"

"وہ اُسے کیوں تلاش کرنا چاہتا ہے؟"

"کیا پتا کیوں تلاش کرنا چاہتا ہے۔"

سب نے اپنے بزرگوں سے قریب قریب یہی جواب سُنے تو مایوس ہو گئے۔

اب اُنہیں جہاں کہیں بھی اِکٹھے ہونے کا موقع ملتا، اجنبی ہی کا ذکر چھیڑ دیتے۔ وہ مایوس تو ضرور ہو گئے تھے مگر جب اُنہیں اجنبی کے یہ الفاظ یاد آ جاتے کہ میں اپنے مقصد میں کام یاب ہو گیا تو ضرور تم لوگوں کو بتا دوں گا تو اُن کے دل میں اُمید پیدا ہو جاتی کہ کسی دن یہ مُعمّا حل ہو جائے گا۔

بارہ دن بیت گئے۔ ایک شام وہ اجنبی اچانک آ گیا۔

"خوش ہو، بچّو؟"

لڑکے اُسے دیکھ کر واقعی خوش ہو گئے تھے۔ اِس لیے ہر ایک نے ہاں میں جواب دیا۔

"بچّو! میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہُوں" اجنبی نے اُنہیں خوش خبری سُنائی۔

"آپ نے وہ بہُت پُرانا برگد کا پیڑ دیکھ لیا ہے؟" ناصِر نے سوال کیا۔

"ہاں، دیکھ لیا ہے۔"

ہر لڑکے کے دل میں یہ سوال پیدا ہُوا کہ کیا ہم بھی اُس پیڑ کو دیکھ سکتے ہیں مگر یہ سوال کسی کے ہونٹوں سے نہ نکلا۔ البتّہ اجنبی نے اُن کے چہروں پر یہ سوال پڑھ لیا۔ اُس نے کہا:

"شاید تم چاہتے ہو کہ اُس پیڑ کو دیکھو۔"

"جی ہاں" سب بیک آواز بول اُٹھے۔

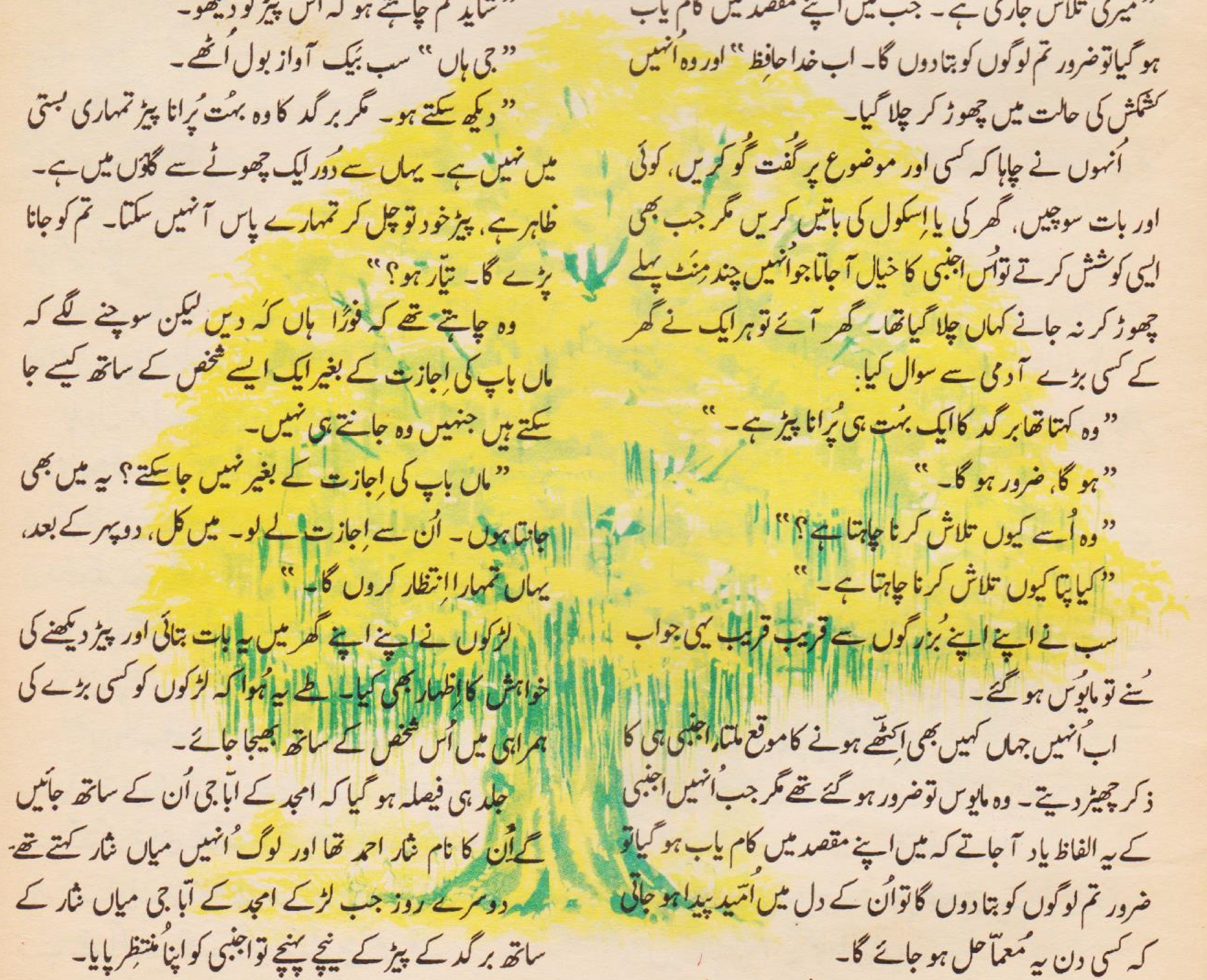

"دیکھ سکتے ہو۔ مگر برگد کا وہ بہُت پُرانا پیڑ تمہاری بستی میں نہیں ہے۔ یہاں سے دُور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہے۔ ظاہر ہے، پیڑ خود تو چل کر تمہارے پاس آ نہیں سکتا۔ تم کو جانا پڑے گا۔ تیار ہو؟"

وہ چاہتے تھے کہ فوراً ہاں کہہ دیں لیکن سوچنے لگے کہ ماں باپ کی اِجازت کے بغیر ایک ایسے شخص کے ساتھ کیسے جا سکتے ہیں جنہیں وہ جانتے ہی نہیں۔

"ماں باپ کی اِجازت کے بغیر نہیں جا سکتے؟ یہ میں بھی جانتا ہوں۔ اُن سے اِجازت لے لو۔ میں کل، دوپہر کے بعد، یہاں تمہارا اِنتظار کروں گا۔"

لڑکوں نے اپنے اپنے گھر میں یہ بات بتائی اور پیڑ دیکھنے کی خواہش کا اِظہار بھی کیا۔ طے یہ ہُوا کہ لڑکوں کو کسی بڑے کی ہمراہی میں اُس شخص کے ساتھ بھیجا جائے۔

جلد ہی فیصلہ ہو گیا کہ امجد کے ابّا جی اُن کے ساتھ جائیں گے۔ اُن کا نام نثار احمد تھا اور لوگ اُنہیں میاں نثار کہتے تھے۔

دوسرے روز جب لڑکے امجد کے ابّا جی میاں نثار کے ساتھ برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچے تو اجنبی کو اپنا مُنتظر پایا۔

اجنبی نے میاں نثار سے اپنا تعارُف کرایا "میرا نام محمّد یوسُف ہے۔ میں شہر میں رہتا ہوں، مگر میرے والِد صاحب

یہاں سے دو میل دور ایک گاؤں میں رہتے تھے کیوں کہ وہاں ان کی زرعی زمین تھی۔ وہ فوت ہو گئے تو ہم زمین بیچ کر شہر چلے گئے۔"

میاں نثار نے بھی اپنے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔

"وہ گاؤں جہاں ہمیں جانا ہے، یہاں سے کتنی دُور ہے؟" یہ سوال میاں نثار نے کیا تھا۔

"کافی دُور ہے۔ بستی کے باہر تانگے مِل جاتے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جائیں گے۔"

بستی کے باہر آکر وہ تانگوں میں بیٹھ گئے تو میاں نثار نے یوسُف سے پوچھا "معاف کیجیے، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ وہ پُرانا پیڑ کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ آپ کا مقصد کیا ہے اُسے دیکھنے سے؟"

یوسُف مسکرا کر بولا "آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔ بتانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میاں نثار چُپ ہو گئے اور تانگے چلنے لگے۔ پُورا گھنٹا سفر میں گزر گیا۔

جب وہ تانگوں سے اُترے تو یوسُف بولا "اب ہمیں تھوڑی دُور پیدل چلنا ہو گا۔"

چاروں طرف ہری ہری فصلیں لہرا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ زرد پڑنے لگی تھی۔ کھیتوں میں کسان ہل جوت رہے تھے۔ اِدھر اُدھر اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ اُن کی اپنی بستی میں یہ سب کچھ نہیں تھا، اِس لیے لڑکے خوشی خوشی چل رہے تھے۔

اُنھیں چلتے ہوئے کئی مِنٹ گزر گئے۔

"بس، اب ہماری منزل آ گئی ہے۔"

یہ سُنتے ہی لڑکے اور میاں نثار رُک گئے۔ رُکنے کو تو وہ رُک گئے مگر حیران تھے کہ وہ جس جگہ کھڑے تھے، وہاں دور دور تک صرف ایک منزلہ اور دو منزلہ مکان دکھائی دے رہے تھے یا کھیت تھے۔ برگد کا کوئی پیڑ نہیں تھا۔

"یوسُف صاحِب، آپ ہمیں کہاں لے آئے ہیں؟" میاں نثار نے پوچھا۔

"وہیں، جہاں ہمیں آنا چاہیئے تھا۔"

"لیکن یہاں تو......" میاں نثار کہنا چاہتے تھے کہ یہاں برگد کا وہ پیڑ کہاں ہے جسے ہم دیکھنے آئے ہیں۔

یوسُف کہنے لگا "گھبرایئے نہیں۔ میں اپنا وعدہ پُورا کروں گا۔ آپ جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ضرور دیکھیں گے"۔

وہ ایک تنگ راستے سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں مٹّی کے ایک چھوٹے سے مکان کے آگے ایک بہُت بوڑھا آدمی چند چھوٹے چھوٹے بچّوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

"یہ ہے وہ بہُت پُرانا برگد کا پیڑ جسے دیکھنے ہم یہاں آئے ہیں۔"

یوسُف نے یہ کہا تو سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

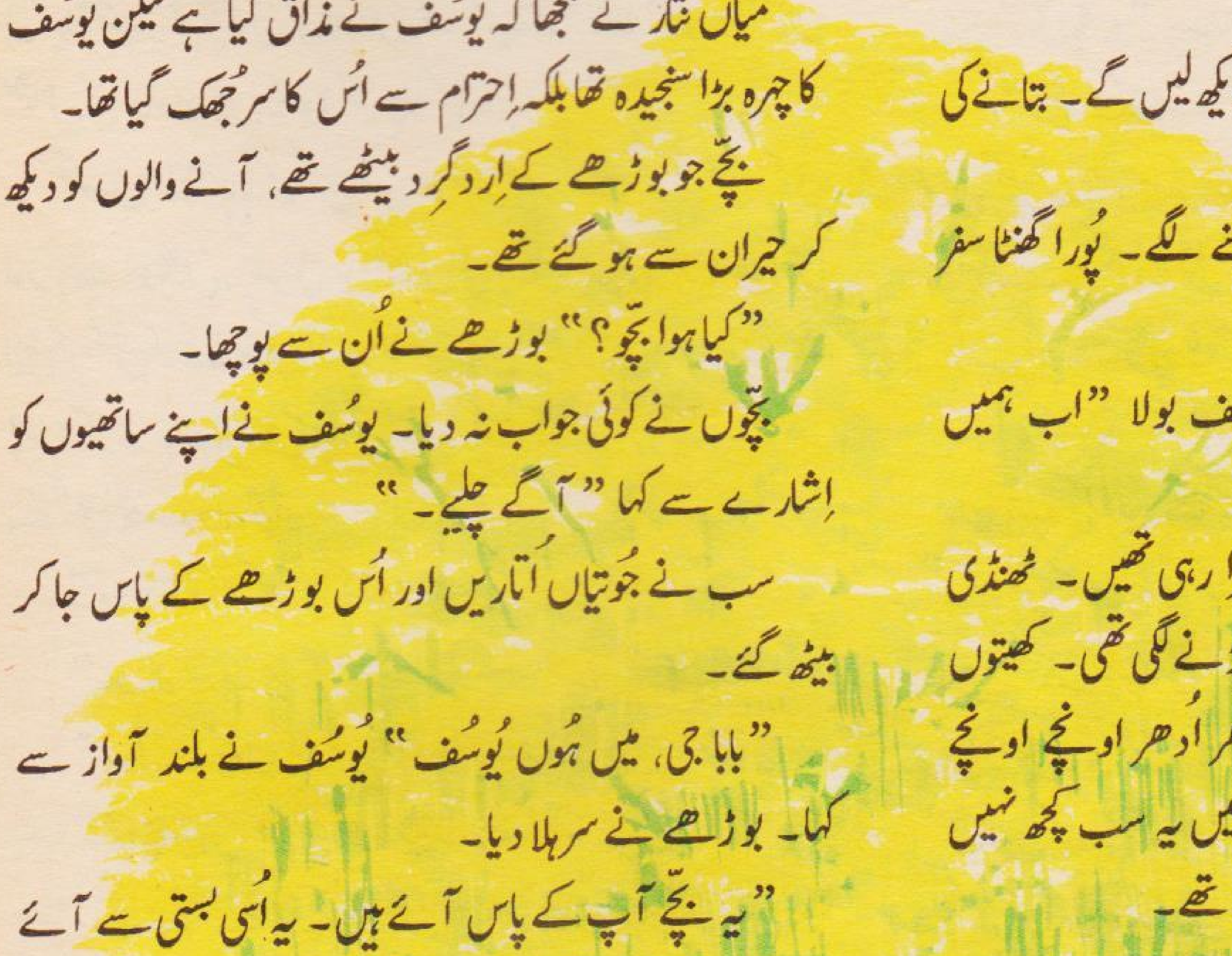

میاں نثار نے سمجھا کہ یوسُف نے مذاق کیا ہے لیکن یوسُف کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا بلکہ اِحترام سے اُس کا سر جُھک گیا تھا۔

بچّے جو بوڑھے کے اِرد گِرد بیٹھے تھے، آنے والوں کو دیکھ کر حیران سے ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا بچّو؟" بوڑھے نے اُن سے پوچھا۔

بچّوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یوسُف نے اپنے ساتھیوں کو اِشارے سے کہا "آگے چلیے۔"

سب نے جُوتیاں اُتاریں اور اُس بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

"بابا جی، میں ہُوں یُوسُف" یُوسُف نے بلند آواز سے کہا۔ بوڑھے نے سر ہلا دیا۔

"یہ بچّے آپ کے پاس آئے ہیں۔ یہ اُسی بستی سے آئے ہیں جہاں آپ نے تیس برس پڑھایا تھا۔"

بوڑھے کا سر پھر ہلنے لگا۔

"یہ بچّے آپ سے خیر و برکت کے طالِب ہیں۔"

"خیر و برکت ...... اللہ دینے والا ہے۔"

بوڑھے نے اپنا دایاں ہاتھ اُوپر اُٹھالیا۔ یوسُف نے لڑکوں کو اُس کے پاس آنے کا اِشارہ کیا۔

ایک ایک لڑکا آتا اور بوڑھا اُس کے سر پر ہاتھ پھیر دیتا۔ جب میاں نثار آئے تو یوسُف بولا "یہ ایک بچّے کے ابّا جی ہیں۔

(باقی صفحہ 47 پر)

# چاند دیوتا کا مندر

محمد یونس حسرت

تنویر اور جمال ریت کے ٹیلے پر کھڑے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے، جہاں آثارِ قدیمہ کے ماہر پروفیسر براؤن کی نِگرانی میں کھُدائی کا کام ہو رہا تھا۔ جمال ایک عرب قبیلے کا چودہ پندرہ سالہ لڑکا تھا اور یہاں دوسرے عرب مزدوروں کی طرح روزانہ اُجرت پر کام کر رہا تھا۔ تنویر ڈاکٹر شہریار کا بیٹا تھا، جو پروفیسر براؤن کے ہونہار اور چہیتے شاگرد تھے اور اپنے اُستاد کی طرح اُنہیں بھی آثار قدیمہ کی کھُدائی کے کام سے گہری دِلچسپی تھی۔ وہ آثارِ قدیمہ کی کھُدائی کی کئی مُہموں میں پروفیسر براؤن کے شریکِ کار رہے تھے۔

مِصر، ماریطانیہ، اِٹلی، تُرکی، پاکستان، سِری لنکا اور کئی دوسرے ملکوں میں اُنہوں نے آثارِ قدیمہ کی کھُدائی کے سِلسلے میں پروفیسر براؤن کے ساتھ ایسی محنت اور لگن سے کام کیا تھا کہ اب پروفیسر آثارِ قدیمہ کی کھُدائی کے سِلسلے میں جہاں بھی جاتے، ڈاکٹر شہریار کو بُلوا بھیجتے۔

آثارِ قدیمہ سے دل چسپی تنویر کو اپنے باپ سے ملی تھی۔ بارہ سال کی عمر کو پہنچتے تک اُس نے ہڑپہ، موئنِ جودڑو، ٹیکسلا اور پاکستان کے وہ تمام مقامات دیکھ ڈالے تھے جہاں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کھُدائی کر چکے تھے یا کر رہے تھے۔ بلکہ سوات کے عِلاقے میں ہونے والی ایک کھُدائی کے کام پر تو وہ اپنے باپ کے ساتھ موقع پر موجود رہا تھا کیوں کہ یہ مُہم پروفیسر براؤن کے سپُرد تھی اور دوسری مُہمات کی طرح ڈاکٹر شہریار اِس مُہم میں بھی اُن کی مدد کر رہے تھے۔

آثارِ قدیمہ کے سلسلے میں اِسی شوق اور دلچسپی کی وجہ سے وہ ضِد کر کے اپنے باپ کے ساتھ اِس مُہم پر آیا تھا جو عرب کے وسیع صحرا میں آثارِ قدیمہ کی کھُدائی کے لیے شروع کی گئی تھی۔ یہاں آنے کے چند دن بعد ہی اُس کی دوستی جمال سے ہو گئی تھی جو اُس کا ہم عُمر تھا۔

اور اِس وقت تنویر اور جمال ریت کے ٹیلے پر کھڑے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سخت دُھوپ اور گرمی میں عرب مزدور کھُدائی کے کام میں لگے ہوئے تھے اور صحرا کی ریت میں سے ایک گول گول سی عِمارت نمودار ہو رہی تھی۔

تنویر کو یہاں آنے کے دوسرے تیسرے دن ہی اِس جگہ کے بارے میں معلُومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اُسے معلوم ہوا

تھا کہ دُور دُور تک پھیلا ہُوا یہ صحرا اب سے تین چار ہزار سال پہلے ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ اُس وقت اِس علاقے کے لوگ چاند، سُورج، آگ وغیرہ کی پُوجا کرتے تھے اور اِس پُوجا پاٹ کے لیے اُنھوں نے میں مختلف جگھوں پر چھوٹے بڑے مندر بنا رکھے تھے۔ اِن میں ایک مندر جو چاند دیوتا کا مندر کہلاتا تھا، باقی سب مندروں سے بڑا تھا۔ اِس مندر میں پوجا پاٹ کرنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے اور سونا، چاندی اور ہیرے جواہرات کے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ زلزلوں یا ریت کے طوفانوں کی وجہ سے یہ سرسبز و شاداب علاقہ بیابان صحرا میں تبدیل ہو گیا تھا اور اِس کی عمارتیں صحرا کی ریت تلے دب گئی تھیں۔

دُنیا کے مختلف ملکوں میں آثارِ قدیمہ سے دلچسپی کے باعث یہ صحرائی علاقہ بھی آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی نظر میں آ گیا تھا۔ اِس سلسلے میں کئی جگھوں پر چھوٹی موٹی کُھدائیاں ہوئی تھیں مگر وہاں سے کوئی اہم چیز بر آمد نہیں ہوئی تھی۔ اب سُلطان اَبُویمین کی درخواست پر پروفیسر براؤن نے یہاں کُھدائی کا کام شروع کیا تھا اور اپنی مدد کے لیے پاکستان سے ڈاکٹر شہریار کو بُلایا تھا۔ اِن دونوں کی نگرانی میں کئی مہینوں کی مُسلسل کُھدائی کے بعد صحرا کے سینے میں سے ایک گول گول سی عمارت نمودار ہو رہی تھی۔

تنویر نے جمال کا بازو تھام کر تقریباً چیختے ہوئے کہا "ارے، جمال! یہ تو چاند دیوتا کا مندر معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، پروفیسر صاحب اپنی مُہم میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

جمال کی آنکھیں بھی خوشی سے چمکنے لگیں۔ اُس نے کہا "ہاں، یہ چاند دیوتا کا مندر ہی لگتا ہے۔ ہم بزرگوں سے سُنتے آئے ہیں کہ اِس مندر میں ایک خزانہ دفن ہے۔ اب پروفیسر صاحب کو بہت ہوشیار رہنا ہو گا۔"

تنویر کو معلوم تھا کہ صحرا کا یہ علاقہ، صحرا کی ریت کی طرح، مسلسل بے چینی اور بد اَمنی کا شکار رہتا ہے۔ اُسے اِس علاقے کے حاکم سُلطان اَبُویمین اور پروفیسر براؤن کے درمیان ہونے والی بات چیت کا بھی عِلم تھا۔ سُلطان نے پروفیسر براؤن سے کہا تھا:

"میرا ملک ایک غریب ملک ہے۔ دوسرے عرب ملکوں کے پاس تو تیل کی دولت ہے، مگر ہم اِس سے محروم ہیں۔ میری طرف سے آپ کو پوری اِجازت ہے کہ جہاں چاہیں اور جب تک چاہیں کُھدائی کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اِس کُھدائی سے آپ کو ہمارے شان دار ماضی کے بارے میں بہُت قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ مگر یہاں سے آپ کو جو قیمتی چیزیں ملیں، اُن میں ہم اور آپ برابر کے حصّے دار ہوں گے۔ میری دُعا ہے کہ آپ چاند دیوتا کا مندر اور اُس میں چُھپا ہوا خزانہ دریافت کرنے میں کام یاب ہو جائیں۔ میرے لوگوں کو ہسپتالوں، اِسکولوں اور زندگی کی بہُت سی سہُولتوں کی ضرورت ہے، اور میں اُنھیں یہ سہولتیں دینا چاہتا ہوں۔"

پروفیسر براؤن نے سُلطان اَبُویمین کی یہ شرط منظور کر لی تھی اور پھر گہری چھان بین کے بعد ایک جگہ کا اِنتخاب کر کے کُھدائی شروع کرا دی تھی، جس کے نتیجے میں صحرا کے سینے سے چاند دیوتا کے مندر کی گول گول سی عمارت نمودار ہو رہی تھی۔ اور جمال کہ رہا تھا کہ پروفیسر صاحِب کو ہوشیار رہنا ہو گا۔

"کس سے ہوشیار رہنا ہو گا؟" تنویر نے پوچھا "چوروں سے؟"

جمال نے نیچے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا "تم نے شریف ابُو زید کا نام نہیں سُنا؟" تنویر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ ایک ڈاکو اور قاتِل ہے، اور ہاتھ دھو کر ہمارے سُلطان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اُس کی کوشش ہے کہ کسی طرح سلطان کی جگہ خود اِس علاقے کا حاکم بن جائے اور......"

جمال بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔ مزدوروں کی نِگرانی کرنے والے جمعداروں میں سے ایک جمعدار غسّانی سامنے سے آ رہا تھا۔ جمال کو دیکھتے ہی وہ چِلاّیا "ارے کام چور! یہاں کہاں پھر رہے ہو؟ چلو، اپنے کام پر۔" جمال چُپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

"بڑی شان دار عمارت ہے؟" تنویر کے کان میں آواز آئی۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر پروفیسر براؤن کھڑے تھے۔ تنویر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا اُن کے پاس گیا اور بولا "جی ہاں۔"

پروفیسر براؤن مندر کے ستونوں والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگے "ساری کی ساری عمارت سفید سنگِ مرمر کی ہے اور کم سے کم تین ہزار سال پُرانی ہے۔ ایسا خوب صورت مندر تو ہندوستان اور مِصر میں بھی نہیں؟"

پروفیسر براؤن مندر کے اندر داخل ہوئے تو تنویر بھی اُن کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ تاریکی کی وجہ سے پہلے تو اُسے کچھ دکھائی نہ دیا، مگر پھر اُس کی آنکھیں اندھیرے سے ذرا مانُوس ہو گئیں۔ مندر کی دیواروں پر مُختلف نقش و نگار اور مُجسّمے بنے ہوئے تھے جو کاری گری کا نہایت عُمدہ نمونہ تھے۔ ایک جگہ ایک ٹُوٹا ہوا تابُوت پڑا تھا۔ وہ دونوں جُھک کر اُسے دیکھنے ہی لگے تھے کہ مندر کے اندر سے کسی کی آواز آئی:

"پروفیسر صاحِب! پروفیسر صاحِب!"

"یہ" تنویر نے ایک دم چونک کر کہا "یہ تو ابّا جان کی آواز ہے۔"

"ہاں" پروفیسر براؤن بولے "اُنھیں کوئی چیز ملی ہو گی۔ لو، وہ خود ہی آ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر شہریار کے سر کے بال، چہرہ اور لباس سب گُرد میں اَٹے ہوئے تھے اور اس حُلیے میں وہ آدمی سے زیادہ بھوت معلوم ہوتے تھے۔ مگر چشمے کے پیچھے اُن کی آنکھیں خوشی اور جوش سے چمک رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے "پروفیسر صاحِب، یہاں تو اِتنی دولت ہے کہ کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ سونا ہے، چاندی ہے، ہیرے جواہرات ہیں۔ ذرا دیکھیے تو" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر شہریار نے ایک جگ مگ جگ مگ کرتا ہار اُن کی طرف بڑھا دیا جس میں چھوٹے چھوٹے خوب صورت چاند بنے ہوئے تھے۔

"یہ نِفاست اور کاریگری کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے اور خالص سونے کا ہے۔ ایسے ڈھیروں ہار اندر پڑے ہیں۔" ڈاکٹر شہریار نے پروفیسر کو بتایا۔

اچانک قریب ہی کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور پھر ایک سایہ مندر کے اندر سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تنویر نے فوراً اُسے پہچان لیا۔ یہ جمعدار غسّانی تھا۔ تنویر سوچنے لگا کہ غسّانی نے پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہریار کی گُفت گُو سُن تو نہیں لی؟ وہ باہر کیوں گیا ہے؟ اور اُس کی چال سے تیزی کیوں ظاہر ہو رہی تھی؟

پروفیسر اور ڈاکٹر شہریار مندر سے نکلنے والی قیمتی اشیا کی فہرست تیاّر کرنے لگے۔ یہ کام کرتے کرتے اُنھیں ایک گھنٹا

گزر گیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھیں کئی گھنٹے اور لگ جائیں گے۔

تنویر اُن کا ہاتھ بٹا رہا تھا مگر وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اُس کے والد کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ بار بار پروفیسر سے ایک ہی بات کہہ رہے تھے "یہ چیزیں بے حد قیمتی ہیں، پروفیسر صاحب۔ ہمیں سُلطان ابویمین کو فوراً اِطلاع دینی چاہیئے اور ............"

اچانک باہر گولیاں چلنے اور قدموں کی تیز تیز چاپ سُنائی دی۔ ڈاکٹر شہریار نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی اور گھبرا کر باہر کی طرف دیکھا۔ پھر وہ تینوں تیزی سے باہر کی طرف بڑھے اور مندر کی ٹھنڈی تاریکی سے نکل کر باہر کی تمتماتی دھوپ میں آگئے۔

باہر، ٹیلوں کے پاس، پانچ چھ بھاری بھرکم اُونٹ دکھائی دے رہے تھے۔ اُن پر جو آدمی سوار تھے، اُنھوں نے نیلے رنگ کے چُغے پہن رکھے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اِن رائفلوں نے گولیاں اُگلیں تو عرب مزدور چیخیں مارتے ہوئے اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔

جو اُونٹ سب سے آگے تھے، اُن میں سے ایک پر جمعدار غسّانی سوار تھا، اور اُس کے برابر والے اُونٹ پر ایک اور شخص بیٹھا تھا جو صورت شکل سے بدمعاش نظر آتا تھا۔ اُس کی ناک طوطے کی طرح مُڑی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

"یہ شریف ابُوزید ہے!" جمال نے تنویر کے قریب آکر اُس کے کان میں سرگوشی کی اور پھر وہاں سے کِھسک گیا۔

پروفیسر براؤن، ڈاکٹر شہریار اور تنویر اپنی جگہ جم کر کھڑے رہے۔ اُونٹ سواروں نے اُن کے قریب آکر اُونٹ روکے اور پھر نیچے اُتر آئے۔

شریف ابُوزید نے قریب آکر ہاتھ ماتھے تک لے جاکر پروفیسر براؤن کو سلام کیا اور پھر گرج دار آواز میں کہنے لگا

"مجھے ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ آپ کو اِس مندر سے ملنے والی دولت میرے حوالے کرنی ہوگی تاکہ میں ہتھیار خرید سکوں۔"

"مار ڈالو اِن سب کو!" غسّانی نے چیخ کر کہا۔

"خاموش!" شریف ابُوزید نے اُسے ڈانٹا اور وہ سہم کر خاموش ہوگیا "اِنھیں گرفتار کر لو۔ ہم بعد میں فیصلہ کریں گے کہ اِن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پہلے ہمیں مندر کے خزانے پر قبضہ کرنا ہے۔"

"تم ایسا نہیں کر سکو گے" پروفیسر براؤن نے اِطمینان سے کہا "سُلطان کو پتا چلے گا تو............"

"خاموش!" شریف ابُوزید پھر گرجا "سُلطان کو پتا نہیں چلے گا۔"

اُس کے اِن خوف ناک الفاظ کا خوف ناک مطلب اُس کی خونی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ تنویر سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور ایک چُبھتی ہوئی سی سنسناہٹ اُس کی ریڑھ کی

ہڈّی میں دوڑ گئی۔

اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے تنویر نے جو کچھ سیکھا تھا وہ یہ تھا کہ خراب سے خراب حالات میں بھی مایوس نہ ہونا چاہیئے، ہوش و حواس قائم رکھے جائیں، صبر و تحمّل سے کام لیا جائے اور اُمّید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

چُناں چہ جب شریف ابُو زید اور اُس کے آدمی پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہریار کو دھکیلتے ہوئے مندر کے اندر لے جا رہے تھے تو تنویر چُپکے سے وہاں سے کِھسک گیا۔ کسی نے اُس کی طرف توجّہ نہیں کی۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک دُبلا پتلا سا لڑکا اُن کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔

باہر اچانک تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ تنویر نے اُوپر نگاہ اُٹھائی۔ آسمان تاریک ہو رہا تھا۔ ریت کے اُڑتے ہوئے ذرّے اُس کے بازوؤں اور پِنڈلیوں میں سُوئیوں کی طرح چُبھنے لگے تھے۔

یہ ریت کے طوفان کی علامت تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر

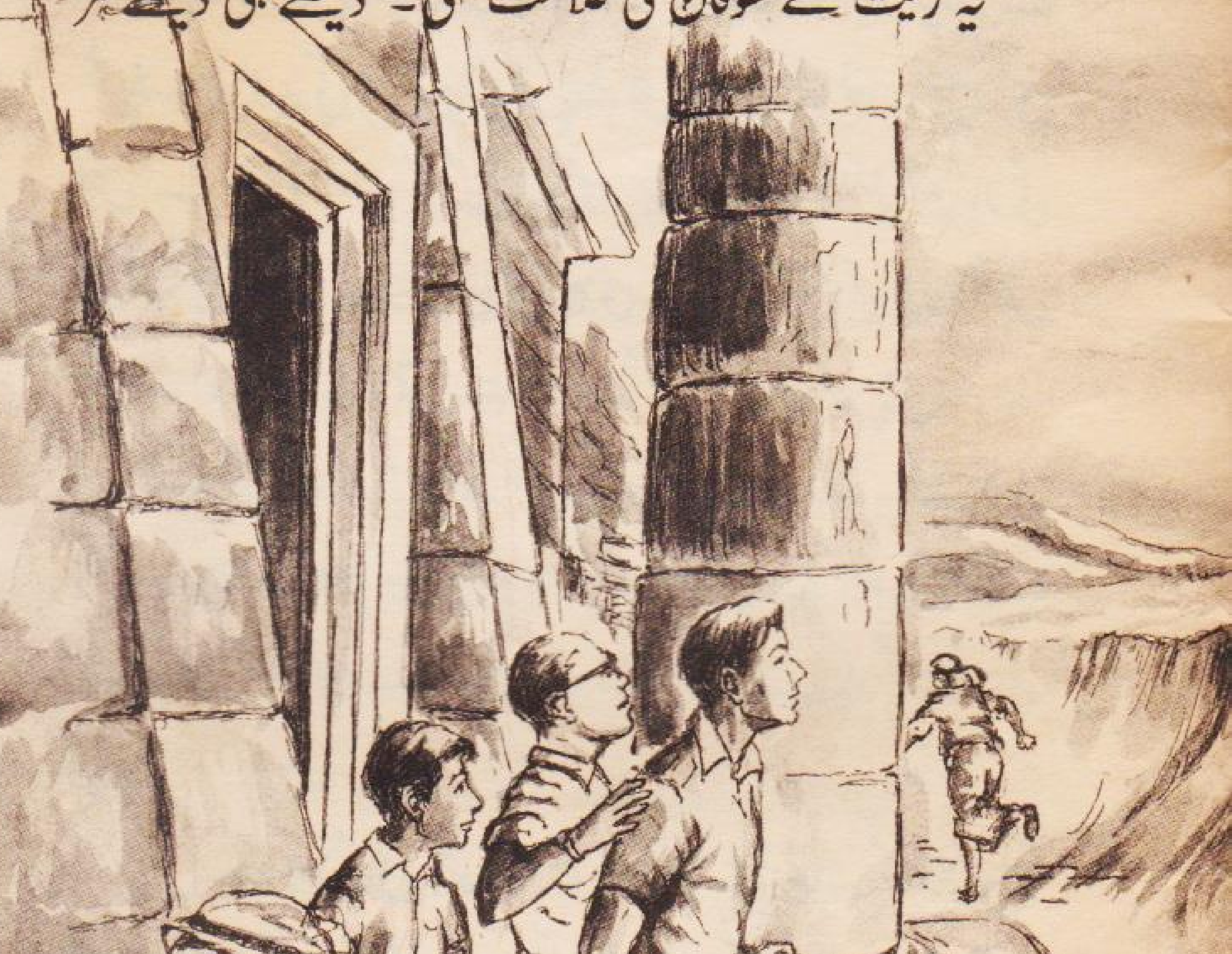

چیز کو ریت کے ایک گہرے زرد رنگ کے غُبار نے چُھپا لیا۔

اِس طوفان سے بچنے کے لیے تنویر مندر کی طرف جانے لگا تو کسی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو جمال کا دُھندلا دُھندلا سا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس نے چیخ کر کہا "تمھارے ابّا جان کی جیپ کہاں ہے؟"

"اُدھر، ٹیلے کے پاس" تنویر نے جواب دیا۔

"تو فوراً جاؤ اور سُلطان کو اِطّلاع کرو!"

"اِس طوفان میں؟" تنویر نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، اِسی طوفان میں" جمال نے جواب دیا۔

جمال ٹھیک کہ رہا تھا۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے ٹیلے کی طرف بڑھے۔ جیپ ٹیلے کے پاس ہی کھڑی تھی مگر طوفان کی وجہ سے اُنھیں اُس تک پہنچنا پہاڑ نظر آ رہا تھا۔

اندھوں کی طرح ڈگ مگاتے، ٹھوکریں کھاتے آخر کار وہ جیپ تک پہنچ گئے۔ تنویر نے ڈیش بورڈ سے چابی نکالی، جیپ کا اِنجن اِسٹارٹ کیا اور وہ دونوں شہر کی طرف روانہ ہو گئے جو وہاں سے تیس میل دور تھا۔

ریت پر جیپ بار بار پِھسلتی اور اُچھلتی تھی، مگر اُس وقت تنویر کے اندر کچھ ایسا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اِسٹیرنگ تھامے ریت کے طوفان کا مقابلہ کرتا ہوا، جیپ کو شہر کی طرف دوڑائے چلا جا رہا تھا۔

جیپ کو پوری رفتار سے بھگاتے بھگاتے تنویر کو اپنے والد ڈاکٹر شہریار اور پروفیسر براؤن کا خیال آیا تو اِسٹیرنگ پر اُس کے ہاتھ ڈگ مگا گئے۔

"کیا بات ہے؟" جمال نے گھبرا کر کہا۔

"میرے والد، اور پروفیسر براؤن!" تنویر نے کہا "جب شریف ابُو زید کو یہ معلوم ہو گا کہ میں سُلطان کو اِطّلاع دینے گیا ہوں تو............"

"تو کچھ نہیں ہو گا" جمال نے اِطمینان سے کہا "کچھ بھی نہیں ہو گا، میرے بھائی۔ یہ طوفان ابھی گھنٹوں اِسی طرح جاری رہے گا۔ میں نے ایسے نہ جانے کتنے طوفان دیکھے

ہیں۔ تم اِطمینان رکھو۔ شریف ابُو زید اور اُس کے ساتھی مندر کے اندر ہی پھنسے رہیں گے۔ لیکن ہمیں جلد از جلد سُلطان کے پاس پہنچنا ہے۔ ذرا رفتار بڑھاؤ۔ ہاں، شاباش!"

جمال نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ واقعی ریت کے طوفان کی وجہ سے شریف ابو زید اور اُس کے ساتھی مندر کے اندر ہی پھنس کر رہ گئے تھے۔ وہ پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہر یار کو مندر کے اندر اِس لیے لے گئے تھے کہ وہ مندر سے حاصل ہونے والا خزانہ ان کے حوالے کر دیں، مگر ریت کے طوفان نے اُن کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ طوفانی ریت اُڑ اُڑ کر اندر آ رہی تھی اور وہ اُس سے بچنے کے لیے ستونوں اور پتّھروں کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

کئی گھنٹے بعد جب ریت کے طوفان کا زور ٹوٹا تو شریف ابو زید اور اس کے ساتھی سروں سے ریت جھاڑتے اور آنکھوں کو ملتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پروفسر براؤن اور ڈاکٹر شہریار ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ شرف ابو زید نے غسّانی کو حکم دیا کہ وہ باہر جا کر اُن اونٹوں کا پتا کرے جنھیں وہ باہر چھوڑ آئے تھے اور پھر اُس نے پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہر یار کو مندر کا خزانہ اُس کے حوالے کرنے کو کہا۔

پروفیسر اور ڈاکٹر شہریار اِس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے ہوں کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ ابھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ مندر کے دروازے کے پاس ایک چیخ سُنائی دی۔ یہ چیخ اُس غسّانی کی تھی جسے شریف ابو زید نے اُونٹوں کا پتا کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اِس چیخ کو سُن کر شریف ابو زید اور اس کے ساتھی گھبرا گئے اور رائفلیں سنبھالے ایک دم باہر کی طرف لپکے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن کے قدم وہیں رُک گئے۔ باہر سُلطان کے سپاہیوں نے مندر کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور اِن سپاہیوں کا افسر میگافون پر شریف ابو زید اور اُس کے ساتھیوں کو وارننگ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"ہتھیار پھینک دو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ تم میں سے کوئی بھی بچ کر جانے نہ پائے گا۔"

شریف ابو زید نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں سُلطان کے پندرہ بیس سپاہی کھڑے تھے جنہوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ اُس نے کچھ سوچا، پھر اپنی رائفل یوں نیچے کی جیسے اُسے زمین پر پھینکنا چاہتا ہو۔ مگر پھر وہ نہایت پُھرتی سے رائفل کا رُخ پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہریار کی طرف کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاید اُس کی چال یہ تھی کہ اُن دونوں کو ہلاک کرنے کی دھمکی دے کر سُلطان کے سپاہیوں کو وہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دے گا۔ مگر ایک ہوشیار سپاہی نے شریف ابو زید کی اِس چال کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ جیسے ہی اُس نے اپنی رائفل کا رُخ پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہریار کی طرف کیا، سپاہی نے بجلی کی سی تیزی سے ایک فائر کیا اور رائفل شریف ابو زید کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔

اب شریف ابو زید اور اُس کے ساتھیوں کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سِوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اُنھوں نے ہتھیار پھینک دیے اور سُلطان کے سپاہیوں نے اُن سب کو گرفتار کر لیا۔

اِس کے بعد وُہی کچھ ہُوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ سُلطان ابُو یمین نے پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر شہریار کے ساتھ ساتھ تنویر اور جمال کو بھی اِنعام و اِکرام سے نوازا۔ اور نوازتا بھی کیوں نہ؟ اُن کی کوششوں سے ایک تو اُسے بے شمار دولت مل گئی تھی، دوسرے وہ بدمعاش شریف ابو زید اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا تھا جو اُس کے لیے ایک مُدّت سے دردِ سر بنا ہُوا تھا۔

# نِیلی

سلیم خاں گگی

"ڈر تھا، چودھری انور کی گھوڑی جیت جائے گی" دادا نے کہا۔ اُس کا نام باز خاں تھا۔

"میرا خیال تھا، ملک رحمت کا گھوڑا جیت جائے گا" مُراد خاں بولا جو باز خاں کا پوتا تھا۔

دونوں کچھ دیر چُپ رہے۔ پھر مُراد خاں بولا "دادا، کُل کتنے گھوڑے اور گھوڑیاں تھیں دوڑ میں بھلا؟"

"کُل پندرہ جانور تھے" دادا نے کہا۔

"نہیں، پندرہ نہیں سولہ تھے۔ میری گھوڑی نیلی بھی تو تھی؟" مُراد نے نیلی کے لفظ پر زور دے کر کہا۔

"ہاں، وہ تو تھی ہی۔ لیکن وہ اپنی تھی اِس لیے میں نے اُسے شمار نہیں کیا" دادا بے پروائی سے بولا۔

وہ دونوں نیلی پر سوار تھے اور کوٹ نیناں سے ڈسٹرکٹ کونسل نارووال کی سالانہ گھُڑ دوڑ جیت کر آ رہے تھے۔ مُراد خاں دادا کے پیچھے بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں پاکستانی پرچم تھا جو اُسے اِنعام میں مِلا تھا۔ پرچم کے عِلاوہ پندرہ ہزار روپے بھی ملے تھے جو دادا کی جیب میں تھے۔ دادا کی عمر ستّر سال تھی اور پوتے کی عمر دس سال۔ دونوں شاہ سوار تھے۔ دادا کا بیٹا اور پوتے کا والد اشرف خاں فوج میں تھا اور اُن دنوں سندھ میں ڈاکوؤں کو پکڑنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ پھر ایک دن اِطّلاع ملی کہ اشرف خاں ڈاکوؤں کا مُقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا ہے۔ حکومت نے مُراد کو کچھ رقم دی اور ایک مُربّع زمین موضع بھاٹ میں الاٹ کر دی۔ اب دادا پوتا بھاٹ میں رہتے تھے اور دوڑ جیت کر اپنے گاؤں جا رہے تھے، جہاں مُراد خاں کی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی راہ تک رہی تھی۔ اُس کا نام بخت آوَر تھا۔

"دادا، یہ تو بتائیے کہ چودھری انور کی گھوڑی اور ملک رحمت کا گھوڑا جیتے کیوں نہیں؟" مُراد خاں نے پوچھا۔

دادا نے گھوڑی کی چال ہلکی کی اور پھر بولا "ہم اِس لیے جیت گئے کہ ہمارا سوار ماہر نکلا" دادا بولا۔

"تو کیا آپ کو شک تھا کہ آپ کا سوار ماہر نہیں ہے؟" مُراد

نے سوال کیا۔
"ہاں، میرا خیال تھا کہ نیلی کا سوار زیادہ ماہر نہیں ہے۔ کچھ کچھ اناڑی ہے" دادا نے مسکرا کر کہا۔
"اور پھر ثابت ہوا کہ سوار ماہر ہے۔ کچھ کچھ اناڑی نہیں ہے۔ ہے نا؟" مُراد خاں بھی مسکرا کر بولا۔
"بالکل دُرست" دادا نے کہا اور نیلی کو ایڑ لگائی۔ اُس کی رفتار تیز ہو گئی۔
شام ہو گئی تھی اور وہ دونوں اُس راستے پر جا رہے تھے جو پاکستان اور بھارت کی سرحد کے ساتھ ساتھ کوٹ نیناں سے جلالہ شریف کی طرف جاتا ہے۔ جلالہ شریف سے آگے پاکستان کا آخری سرحدی گاؤں بھاٹ ہے۔ جہاں اِس گاؤں کی زمین ختم ہوتی ہے وہاں "نوّمین لینڈ" شروع ہو جاتی ہے۔ نومین لینڈ دو ملکوں کے درمیان زمین کا وہ ٹکڑا ہوتا ہے جو کسی ملک کی مِلکیّت نہیں ہوتا۔
دادا نے نیلی کی چال دھیمی کی اور بولا "اِنعام کی پندرہ ہزار کی رقم میں سے دو ہزار روپے تمہارے اُستاد گاموں کو دیں گے"۔
"اُستاد کو تین ہزار روپے دیں گے۔ اُس نے مجھے گھڑ سواری سِکھانے میں بہُت محنت کی ہے" مُراد خاں بولا۔
"اِس میں کوئی شُبہ نہیں۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتا تو کوٹ نیناں کے مقابلے میں تمہاری جِیت پر بہُت خوش ہوتا" دادا نے کہا۔
"اُستاد ہو تو ایسا" مراد خاں بولا۔
"اور شاگرد ہو تو ایسا جیسا میرا مُراد خاں۔ تم نے بھی تو دن رات ایک کر دیا۔ کھانا پینا بھول گئے۔ دو ہی کام تھے تمہیں۔ کتابیں اور گھُڑ سواری۔"

شام گہری ہو گئی تھی اور پرندے گھونسلوں کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ جو گھونسلوں میں بیٹھے تھے، وہ شور مچا رہے تھے۔ "کچھ دیر بعد سبھی پرندے گھونسلوں میں سو جائیں گے" مُراد خاں نے سوچا۔ وہ اب جلالہ شریف کی ایک گلی میں داخل ہو گئے تھے اور نیلی کی چال اور مدّھم ہو گئی تھی۔
جب گھوڑی گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں آئی تو دادا بولا "یہ جان کر کہ مُراد خاں گھُڑ دوڑ میں اوّل آیا ہے اور اُس نے اِنعام جیتا ہے، تمہاری ماں کتنی خوش ہو گی۔"
"ہاں، ماں بہُت خوش ہو گی۔ لیکن زیادہ خوش تب ہو گی جب میں کپتان بنوں گا" مُراد خاں بولا۔
"مُراد خاں، بڑ کے درخت کی جگہ بڑ کا درخت ہی اُگتا ہے۔ تمہارا باپ بڑا آدمی تھا، اِس لیے اُس کا بیٹا بھی بڑا آدمی بنے گا، اِن شاء اللہ" باز خاں نے کہا۔
"میرا دادا بھی بڑا آدمی ہے۔ وہ گاؤں کا نمبر دار ہے" مُراد خاں بولا۔
دونوں ہنسنے لگے اور پھر اپنے گاؤں بھاٹ میں داخل ہو گئے۔ جب وہ حویلی میں پہنچے تو مُراد خاں کی ماں اُن کا اِنتظار کر رہی تھی۔ مراد خاں نے پاکستانی پرچم ماں کو دے دیا اور باز خاں نے پندرہ ہزار روپے اپنی بہُو کو دیے۔ ماں نے مراد خاں کا ماتھا چوما اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے لوگ اِکھٹّے ہو گئے اور مراد خاں کو شاباش اور باز خاں کو مُبارک باد دینے لگے۔ اِن میں اُستاد گاموں بھی تھا جو بُخار ہی کی حالت میں چلا آیا تھا۔
اگلے دن سویرے جب باز خاں نماز پڑھنے کے لیے اُٹھا تو اُس نے دیکھا کہ گھوڑی جانوروں کے باڑے میں نہیں ہے۔ اُس کا کھُونٹا خالی تھا۔ وہ چوری ہو گئی تھی!
مُراد خاں باڑے میں آیا تو باز خاں نے کہا "نیلی کو بھارت کے وہ چور چُرا کر لے گئے ہیں جن کو سانسی کہا جاتا ہے۔ سانسی پیشہ وَر چور ہیں۔ وہ اور کوئی کام نہیں کرتے۔ بس چوری کرتے ہیں۔"
"یہ کیسے معلوم ہوا کہ نیلی کو بھارت کے سانسی چوروں نے چُرایا ہے؟" مراد خاں نے دادا سے پوچھا۔
"میں نے نیلی کے سُموں کے نشان بارڈر کی طرف جاتے ہوئے دیکھے ہیں، گنّوں کے کھیت کی پگڈنڈی پر سے" بوڑھا

باز خاں بولا۔

"کہاں تک گئے ہیں یہ نشان، دادا؟" مُراد نے سوال کیا۔

"میں نومین لینڈ تک گیا ہوں۔ جہاں سرحد ختم ہوتی ہے وہاں اُج ندی شروع ہوتی ہے۔ گھوڑی کے قدموں کے نشان اُج ندی کے کنارے تک گئے ہیں۔ اِس کے بعد پانی میں اُتر گئے ہیں۔ ظاہر ہے کتھلور گاؤں کے سانسی چُرا کر لے گئے ہماری گھوڑی کو" دادا افسُردگی سے بولا۔

"اب کیا کیا جائے؟" مراد خاں نے پوچھا۔

"رینجرز سے بات کرنا ہوگی۔ وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں" دادا نے کہا۔

"پہلے کبھی رینجرز نے مدد کی ہے، چوری کے معاملے میں؟" مراد خاں نے پوچھا۔

"ہمارے رینجرز تو بھارت کے رینجرز کو چور پکڑنے اور مویشی واپس کرنے کے لیے کہتے ہیں، لیکن وہ ہمارے ساتھ تعاوُن نہیں کرتے" باز خاں نے مایُوسی سے کہا۔

"ہمیں خود کچھ کرنا چاہیئے، دادا" مُراد خاں بولا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟ چور کتھلور کے چودھریوں کے خاص آدمی ہیں، اور اُن چودھریوں سے ہماری مُلاقات ناممکن ہے۔ اُن سے ملاقات کے لیے ہمیں اپنی سرکار سے اِجازت لینا ہوگی، اور ایسی اِجازت کبھی نہیں ملتی" باز خاں بولا۔

مراد خاں خاموشی سے اُٹھا اور گنّوں کے کھیت کی طرف چل دیا۔ نیلی کے سُموں کے نشان صاف اور واضح تھے۔ وہ اُن پر پیر رکھتا ہوُا چلنے لگا۔ ایک گھنٹا چلنے کے بعد وہ اُج ندی کے دائیں کنارے پر کھڑا تھا۔ ندی پر بگلے اور دوسرے آبی پرندے اُڑ رہے تھے۔ ندی کے اُس پار موضع کتھلور تھا جہاں اُس کی نیلی تھی۔

کتھلور گاؤں میں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ شاید عورتیں دوپہر کا کھانا تیاّر کر رہی تھیں یا چُولہوں پر دودھ رکھا ہوا تھا تاکہ گرم ہو جائے۔ وہ دیر تک ندی کنارے کھڑا کتھلور کی طرف دیکھتا رہا۔

ہر طرف سکون تھا۔ شور تھا تو صرف آبی پرندوں کا جو ندی کے اُوپر اُڑ رہے تھے تاکہ مچھلیوں کا شکار کر سکیں۔

یہ خزاں کے دن تھے۔ اُداس، خاموش دن۔ ہر سُو زَردی کِھنڈی ہوئی تھی۔ جنگل کے درخت اور جھاڑیاں سبھی زرد تھے۔ کھیتوں میں گنّے کی فصل تھی اور گنّوں کے پتّے بھی زردی مائل تھے۔ ندی میں پانی کم تھا۔ اگر دونوں طرف کے رینجرز اِجازت دیتے تو بھاٹ اور کتھلور کے لوگ مل کر مچھلی کا شکار کھیل سکتے تھے۔ ایسا دو بار ہو چکا تھا۔

وہ واپس بھاٹ آ گیا۔ اُس نے دوپہر کو کچھ نہ کھایا اور اُداس اُداس گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ دادا اور پوتے نے طے کیا تھا کہ وہ ایک دن کے لیے نیلی کی چوری کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے یہاں تک کہ مُراد خاں کی والدہ سے بھی نہیں۔

جب دن ڈھلنے لگا تو اُس کے قدم از خود باڑے کی طرف اُٹھ گئے۔ جانوروں کے باڑے میں نہ دادا تھا اور نہ نیلی۔ اُس نے سوچا، ممکن ہے دادا پولیس یا رینجرز کو اِطلاع دینے گیا ہو۔ وہ حویلی میں آیا، دادا کے کمرے میں گیا، الماری کھولی جس میں دادا کا پستول پڑا تھا۔ اُس نے پستول اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ اُسے پستول چلانا آتا تھا۔ اِس کی تربیت اُس نے اپنے دادا سے حاصل کی تھی۔

جب وہ حویلی سے باہر نکلا تو اُس کا دادا باہر کھڑا تھا۔ اُس نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ نیلی مِل جائے گی۔"

"نیلی نہیں ملے گی، دادا۔ وہ اُسے سرحد کے اُس پار لے گئے ہیں۔ وہ اُسے واپس نہیں کریں گے" مُراد خاں بولا۔

"ہم پولیس اور رینجرز کی مدد لیں گے۔ نیلی مل جائے گی" دادا نے اُسے تسلّی دی۔

"جب تک پولیس والے اور رینجرز ہماری مدد کریں گے، وہ نیلی کو فروخت کر چکے ہوں گے" مراد خاں مایوس ہو کر بولا۔

"بیٹے، گھر جاؤ۔ کھانا کھاؤ۔ مجھے تمہاری والِدہ نے بتایا

ہے کہ تم نے آج کھانا نہیں کھایا ہے" دادا نے پیار سے کہا۔

"میرا جی نہیں چاہتا، دادا" وہ بے دِلی سے بولا۔

"حوصلہ کرو۔ ہم پندرہ ہزار روپے کی گھوڑی خرید لیں گے، اپنے مُراد خاں کے لیے" دادا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"وہ بھی چوری ہو جائے گی۔ اُسے بھی سرحد پار کے سانسی لے جائیں گے" مراد خاں نے غصّے سے کہا اور وہاں سے چل دیا۔

وہ سیدھا اُج ندی کے کنارے پر آیا۔ کچھ دیر وہاں رُکا، پھر جُوتے اُتار کر بغل میں دابے اور ندی میں پیر رکھ دیے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ کتھلور کی ایک گلی میں گھوم رہا تھا۔ پستول اُس کے پاس تھا۔ اُس نے اپنا سر اور جسم کھدّر کی چادر میں چُھپا رکھا تھا۔

گاؤں کی تیسری گلی میں گھُومتے ہُوئے وہ ایک حویلی کے سامنے جانِکلا۔ پانچ چھ آدمی حویلی کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے اور دروازہ کھلا تھا۔ وہ دروازے میں سے اندر جھانک رہے تھے۔ وہ اُن کے پاس جاکھڑا ہوا اور حویلی کے اندر جھانکنے لگا۔

سامنے نیلی کھڑی تھی!

وہ چادر میں لپٹا ہُوا حویلی کے اندر داخل ہوا۔ جب اُس نے نیلی کے قریب جا کر اپنے سر سے چادر اُتاری اور اُسے پگڑی کے انداز میں سر پر کس کر باندھا تو نیلی ہِن ہِنانے لگی۔ دروازے کے باہر سے ایک آواز بلند ہوئی "گھوڑی اِس لڑکے کو پہچانتی ہے!"

مُراد خاں نے کھُونٹے سے نیلی کا رسّا کھولا اور اُسے حویلی سے باہر لے آیا۔ دروازے کے باہر کھڑے پانچ چھ آدمی اُسے غور سے دیکھنے لگے۔

"میری مدد کرو" مُراد خاں نے ایک شخص سے کہا۔

اُس آدمی نے جُھک کر اپنا گھُٹنا آگے کر دیا۔ مراد خاں نے اُس پر دایاں پیر رکھا اور اُچھل کر سوار ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟" گلی میں ایک رُعب دار آواز گونجی۔

مراد خاں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک شخص جس کی بڑی بڑی خُوں خوار مونچھیں تھیں، اُس کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔ مراد خاں نے جلدی سے جیب میں سے پستول نکالا اور اُس پر فائر کر دیا۔

مونچھوں والا آدمی لڑکھڑایا اور پھر گھوڑی کے پاس آکر گر پڑا۔ مراد خاں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور اُس کا مُنہ اُج ندی کی طرف کر دیا۔

نیلی ندی پار کر کے بھاٹ کی طرف سرپٹ بھاگی جا رہی تھی اور سارا کتھلور شور میں ڈُوبا ہُوا تھا۔

دانائی کی باتیں

# سُنہری چِڑیا

# ہم روزے کیوں رکھتے ہیں؟

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سُنہری چڑیا بولی:

پیارے بچّو، یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رمضانُ المُبارک کے روزے ہم پر فرض کیے ہیں۔ روزہ رکھنا ہر اُس شخص پر فرض ہے جو روزہ رکھ سکتا ہو۔ چھوٹے بچّوں، بیماروں اور معذُوروں، نیز مُسافروں پر روزے فرض نہیں۔ لیکن میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم روزے کیوں رکھتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ نے ہم پر روزے کیوں فرض کیے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اللہ کے اِس حکم پر غور کیا ہے؟ نہیں کیا تو غور کرنا چاہیئے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں ایک گھڑی غور و فکر کرنا ساٹھ ستّر برس کی عِبادت سے افضل ہے۔ یعنی اِس کا ثواب بہُت زیادہ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قُرآنِ مجید میں فرماتا ہے کہ مسلمانو، ہم نے تم پر روزے اِس لیے فرض کیے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ (تقوا) پیدا ہو۔ قرآنِ مجید کی رُو سے تقویٰ کے معنی ہیں: ہدایت پانے یا نیکی کے سیدھے راستے پر چلنے کی آرزو، اور نیکی کے راستے سے بھٹک جانے یا گُم راہ ہو جانے کا خوف۔ یہ ہے رمضانَ المبارک کے روزے رکھنے کا مقصد اور فائدہ۔ غور کریں تو یہ فائدہ اِس قدر زیادہ ہے کہ عام لوگ اِس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

اب میں آپ کو روزوں کے فائدے بتاتی ہوں۔ روزہ رکھنے سے اِنسان میں اللہ کا نیک بندہ بن کر زندگی بسر کرنے کی آرزو زندہ و بیدار ہو جاتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ وہ ہوتا ہے جو اُس کے احکام اور تعلیمات پر عمل کرتا ہے اور اُن کاموں اور باتوں سے بچتا ہے جن کے کرنے سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔

الغرض، روزے رکھنے سے اِنسان متقی (مُت تقی) یعنی پرہیز گار بنتا ہے۔ اب مُتّقی اِنسان کی چند بڑی بڑی صِفتیں آپ کو بتاتی ہوں تاکہ آپ معلوم کریں کہ آپ میں یہ صِفات پائی جاتی ہیں؟ اگر نہیں پائی جاتیں تو متقی بننے کے لیے اپنے اندر یہ صِفات پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مُتّقی بندوں سے پیار کرتا اور اُن کو اِنعام و اِکرام سے نوازتا ہے اور اُس نے اُن کے لیے اپنی بڑی ہی خوب صورت اور پیاری جنّت تیّار کر رکھی ہے۔ اب ذرا توجّہ سے سُنیں۔

مُتّقی اِنسان وہ ہوتا ہے جو اپنے ماں باپ کے ساتھ اچّھا سلوک کرتا اور اُن کی فرماں برداری کرتا ہے، اپنے اُستادوں یا ٹیچروں کا ادب و اِحترام کرتا اور اُن کا کہا مانتا ہے، نیز عِلم حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور اپنا وقت ضائع نہیں کرتا، وہ قُرآنِ مجید کی باقاعدہ اور روزانہ تِلاوت کرتا اور اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، پانچوں وقت با جماعت نماز قائم کرتا ہے، اپنے غریب ہم جماعتوں اور دوستوں کی مدد کرتا ہے، ہمسایوں کے کام کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے اور جھوٹ سے پرہیز کرتا ہے، کسی کو تکلیف نہیں دیتا، کسی کا مذاق نہیں اُڑاتا اور نہ اپنے آپ کو بڑا اور نہ کسی کو اپنے سے چھوٹا سمجھتا ہے۔ وہ اچّھے اور نیک ساتھیوں میں رہنا پسند کرتا اور بُروں کی صُحبت سے نفرت کرتا ہے۔ وہ سچّا سودا کرتا ہے۔

بچّو، جانتے ہو سچّا سودا کیا ہے؟ سُنو، میں بتاتی ہوں۔ وہ

اللہ کی راہ میں یعنی اُس کے بندوں کے لیے مال و جان قُربان کرنے کے لیے تیّار رہتا ہے اور اُس کے بدلے اُس کی جنّت خریدتا ہے۔ جانتے ہو، جنّت کیا ہے؟ اللہ پیارا قرآنِ پاک میں فرماتا ہے کہ جنّت آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ وہ بے حد خوب صورت اور پیاری جگہ ہے۔ آدمی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ جنّت یا بہشت میں ہر وہ نعمت ہوگی جو اہلِ جنّت چاہیں گے۔ اُس میں طرح طرح کے لذیذ پھل اور شربت ہوں گے۔ وہاں اللہ کے پیارے بندے ہوں گے۔

بچّو، جنّت کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہاں موت نہ ہوگی۔ وہاں کوئی شخص مرے گا نہیں۔ ہمیشہ زندہ رہے گا اور خوشی خوشی رہے گا۔ اب میں آپ کو جنّت کی ایک ایسی خوبی بتاتی ہوں جس کا آپ تصوّر تک نہیں کر سکتے۔ وہ خوبی یہ ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ جو بے حد حسین ہے، اہلِ جنّت کو اپنی صورت دکھائے گا، اور وہ اُسے دیکھتے رہ جائیں گے، اور چاہیں گے کہ بس دیکھتے ہی رہیں۔

یہ ہے جنّت جس کی خوب صورتی اور نعمتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اس لیے کہ کسی انسان نے اُسے دیکھا تک نہیں۔ اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہمارے پیارے اور مہربان اللہ نے کیوں اپنے بندوں کو ماہِ رَمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔

اِس کے عِلاوہ روزوں کے اور بھی فائدے ہیں۔ اِن سے اِنسان کو اِس بات کا اِحساس ہوتا ہے کہ بھوک اور پیاس کیا ہوتی ہے۔ جس شخص میں یہ شعور پیدا ہو جائے، وہ انسان تو انسان کسی جان دار کو بھی بھوکا پیاسا نہیں دیکھ سکتا۔ اُس میں یہ آرزو پیدا ہو جائے گی کہ دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا رہے نہ پیاسا۔ ایسے انسان کو درد مند اور صالح کہتے ہیں۔ اگر سب لوگ ایسے ہو جائیں تو دنیا میں بھوک رہے نہ پیاس اور دنیا رشکِ جنّت بن جائے۔ اِس میں لوگ صالح بھائیوں کی طرح زندگی کریں، جھگڑا کریں نہ فساد، چوری کریں نہ ڈاکا ڈالیں، رِشوت لیں نہ سُود کھائیں، خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کِھلائیں۔ اگر آپ دُنیا کو ایسا بنانا چاہتے ہیں تو پھر آپ میں سے جو روزہ رکھنے کے قابل ہوں، ضرور روزہ رکھیں اور اِس طرح اللہ تعالیٰ کے دوست، پیارے اور اُس کی جنّت کے وارث بن جائیں۔

روزوں کے اور بھی بہُت سے فائدے ہیں۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ صِحّت ہزار نعمت ہے اور صحّت مند جسم میں ہی صحّت مند ذہن ہوتا ہے۔ ذہن صحّت مند ہو تو عقل بھی تیز اور نورانی ہوتی ہے، انسان کے خیالات اعلیٰ ہوتے ہیں، اِس لیے اُس کی سوچ بھی سچّی ہوتی ہے۔ اُس میں علم و فن سیکھنے کی اُمنگ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان ذہین ہوتا ہے، اور ذہین طالبِ عِلم ہی اِمتحانوں میں نُمایاں پوزیشن حاصل کرتے اور ترقّی کرتے ہیں۔ یہ بھی آپ نے سُنا ہوگا کہ ڈاکٹروں کا یہ فیصلہ ہے کہ روزے ہماری تن دُرستی اور ذہنی صِحّت کے لیے بہُت ہی مُفید ہیں۔ اِن سے کئی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور صحّت بحال ہو جاتی ہے۔ نیز انسان کئی ایک بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔ سارا دن کھانے پینے سے پرہیز کی وجہ سے روزے دار میں صبر کی قُوّت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کئی بُری عادتوں کو چھوڑنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مثلاً سِگرٹ نوشی اور بِسیار خوری وغیرہ سے۔ بِسیار خوری کا مطلب ہے ضرورت سے زیادہ کھانا پینا، نیز بے وقت کھانا یا دن میں کئی بار کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا جس کے سبب ہضم خراب ہو جاتا ہے، اور ہضم خراب ہو جائے تو اِنسان پیٹ کی کئی مُوذی بیماریوں میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔

اِس گُفت گُو سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمارے رب نے ہمیں کیوں ماہِ رَمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔

بچّو، آخر میں آپ کو یہ اہم بات بھی بتانا چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری کلام، قُرآنِ پاک، رَمضانُ المُبارک کی ایک مُبارک رات میں نازل کیا تھا، جسے لیلۃُ القدر یا شبِ قدر کہتے ہیں۔ اب میں رُخصت ہوتی ہوں۔ اللہ حافظ!

# سائنس کے کھیل

## آیئے، بندوق چلائیں

سامان: شیشے یا دھات کی 4 سے 6 اِنچ لمبی نلی (ٹیوب) - پنسل - آلو کے قتلے -

چار پانچ انچ لمبی شیشے یا دھات کی بنی ہوئی ایک ٹیوب (نلی) لے لیں۔ آلو کے دو قتلے اِس طرح کاٹ لیں جیسے چپس بنانے کے لیے کاٹے جاتے ہیں مگر بہت باریک نہ ہوں، ذرا موٹے ہوں۔ قتلے کو نیچے رکھ دیں اور اُس پر نلی کا ایک سرا رکھ کر دبائیں۔ آلو کا ٹکڑا نلی کے مُنہ میں پھنس جائے گا۔ اِسی طرح دوسرے سِرے میں بھی آلو کا ٹکڑا پھنسا دیں۔ اِس کے بعد ایک پنسل لے کر ایک طرف سے آلو کے ٹکڑے کو نلی کے اندر دھکیلنا شروع کریں۔ نلی کے دوسرے سِرے کو اُس چیز کی طرف کریں جس کا آپ نشانہ لینا چاہتے ہیں۔ پنسل کو نلی میں دھکیلتے جائیں۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے سرے سے آلو کا ٹکڑا نکل کر سیدھا نشان پر جا لگے گا۔

جب آپ ایک طرف سے آلو کے ٹکڑے کو نلی کے اندر دھکیلنا شروع کرتے ہیں تو دوسرے سِرے پر ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، اور جب یہ ہوا نلی کے اندر کم جگہ میں نہیں سما سکتی تو اُس کے دباؤ کی وجہ سے دوسرے سرے سے آلو کا ٹکڑا پوری قوّت سے باہر نکل جاتا ہے۔

## بوتل کی توپ

سامان: خالی بوتل - چمچہ بھر سرکہ - بیکنگ پاؤڈر - کاغذ کا رومال - دو گول پنسلیں -

ایک بڑی بوتل لے کر اُس میں اِتنا سرکہ ڈال دیں کہ جب بوتل کو پہلو کے بَل لِٹایا جائے تو سرکہ گرنے نہ پائے۔ زمین پر دو پنسلیں آگے پیچھے تقریباً چار اِنچ کے فاصلے پر رکھ دیں۔ پھر کاغذ کے ایک چھوٹے سے رومال میں چمچہ بھر بیکنگ پاؤڈر ڈال کر رومال کو لپیٹ دیں اور اُس کو دوہرا کر کے بوتل کے اندر دھکیل دیں۔ اِس کے بعد بوتل کے مُنہ پر جلدی سے کارک لگا دیں اور اُس کو جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے، پنسلوں کے اُوپر پہلو کے بَل لِٹا دیں۔ کارک زیادہ ٹائٹ نہ ہو۔

تھوڑی دیر بعد جب بیکنگ پاؤڈر سرکے میں حل ہو گا تو اُس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس پیدا ہو گی۔ اِس گیس کے دباؤ کی وجہ سے کارک ایک دھماکے کے ساتھ بوتل میں سے نکل کر دُور جا گرے گا اور بوتل پنسلوں کے اُوپر توپ کی طرح پیچھے کو ہٹے گی۔

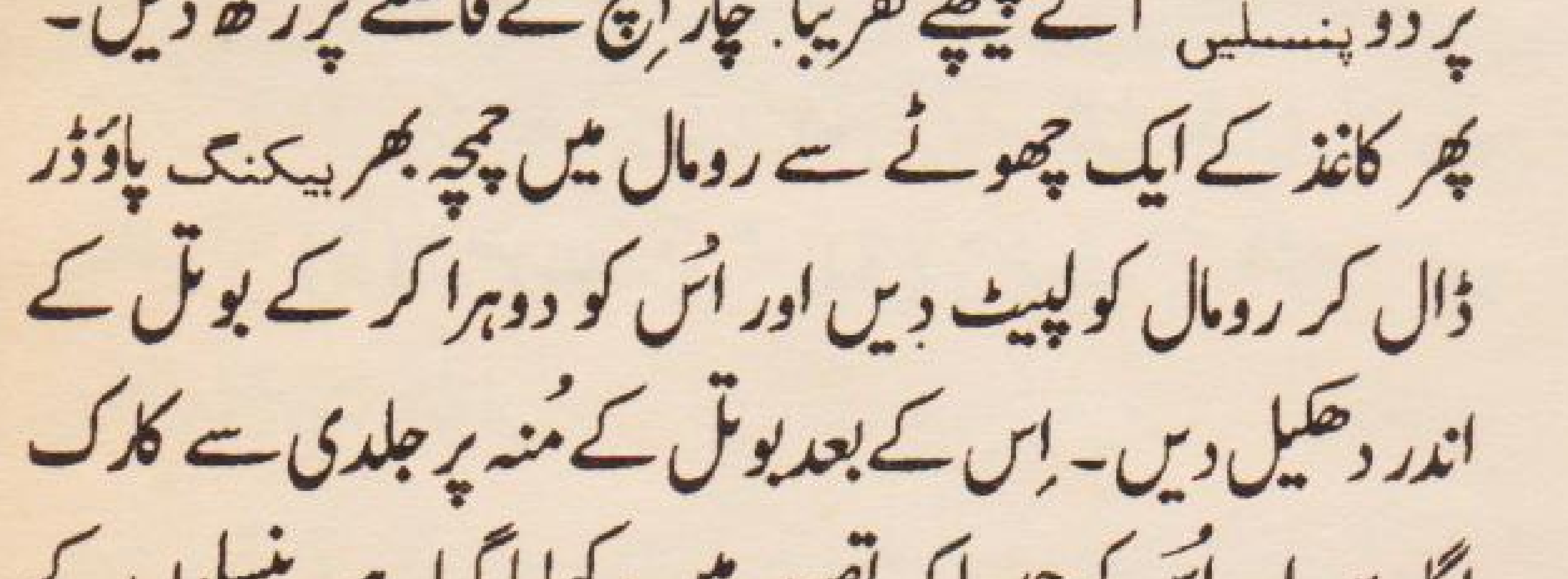

تاریخِ اِسلام کی کہانی

# پیارے نبی ؐ کے پیارے بچّے بچّیاں

ڈاکٹر عبدالرؤف

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مُصطفیٰ صلّی اللہ علیہِ وسلّم کو اللہ تعالیٰ نے سات بچّے بچّیاں عطا فرمائے تھے۔ تین بچّے اور چار بچّیاں۔ آپ کو اُن سے بڑا پیار تھا۔ تینوں بچّے اِبتدائی عمر ہی میں وفات پا گئے۔ اُن کے نام یہ ہیں (1) حضرت قاسم ؓ (2) حضرت عبدُاللہ ؓ (3) حضرت اِبراہیم ؓ۔

حضرت قاسم ؓ تھوڑا بہت چلنا پھرنا ہی سیکھے تھے کہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ آنحضور ؐ کی کُنیت ابُو القاسم اِنہی کے نام پر ہے۔ حضرت عبدُاللہ ؓ بھی بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات پر سُورہ کوثر نازل ہوئی۔ حضرت اِبراہیم ؓ بھی شِیر خوارگی ہی میں اِنتقال فرما گئے۔

آنحضور ؐ کی چار بچیّوں کے نام یہ ہیں (1) حضرت زینب ؓ (2) حضرت رُقیہ ؓ (3) حضرت اُمّ کُلثوم ؓ اور (4) حضرت فاطمہ ؓ۔

حضرت زینب ؓ کی شادی ابُو العاص بِن ربیع سے ہوئی۔ آپ 8 ھ میں مدینہ مُنوّرہ میں انتقال فرما گئیں۔ حضرت رُقیہ ؓ آنحضور ؐ کی دوسری صاحب زادی ہیں۔ آپ کا نکاح حضرت عُثمان بن عفّان ؓ سے ہوا۔ آپ جنگِ بدر کے ایّام میں مدینہ میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ نبی اکرم ؐ کی تیسری صاحب زادی کا نام اُمّ کلثوم ؓ ہے۔ حضرت رُقیہ ؓ کی وفات کے بعد آپ کا نکاح حضرت عُثمان ؓ سے ہوا۔ اِسی لیئے حضرت عثمان ؓ کو "ذُوالنُّورَین" یعنی "دو روشنیوں والے" کا خطاب ملا۔ حضرت فاطِمۃُ الزہرا ؓ آپ کی چوتھی صاحب زادی ہیں۔ آپ کا نکاح حضرت علی المرتضیٰ ؓ سے ہوا۔ آپ کو "جنّت کی خواتین کی سردار" کا لقب عطا ہوا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو آپ سے بےپناہ محبت تھی۔ رمضانُ المبارک 11 ھ میں آپ اِنتقال فرما گئیں۔

# خوف کی وہ رات

رِضوانہ سیّد علی

قُریشی صاحب بہُت زندہ دل اور ہنس مکھ اِنسان تھے۔ تھے تو بزُرگ مگر بچّوں میں بچّہ اور جوانوں میں جوان بن جاتے۔ مچھلی کا شکار اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر محفل میں وہ اِس شکار کے عجیب عجیب قصّے سُناتے تھے کہ جب وہ فلاں جھیل پر شکار کرنے گئے تو کیا ہُوا اور فلاں دریا کے کنارے کیا واقعہ پیش آیا۔

ایک روز ہمارے ہاں آئے تو ہم نے نہایت گرم جوشی سے اُن کا اِستقبال کیا۔ سخت سردیوں کا موسم تھا۔ سب رضائیوں اور کمبلوں میں لِپٹے بیٹھے تھے۔ چائے اور مونگ پھلی کا دَور چل رہا تھا، اور ساتھ ہی ایک گرما گرم بحث بھی چھِڑی ہوئی تھی۔ ہُوا یہ کہ جوں ہی میں باورچی خانے میں جانے کے لیے کمرے سے باہر نکلی، ایک کالی بِلّی اُچھل کر دیوار پر چڑھ گئی، اور اُسے دیکھ کر میرے مُنہ سے نہ صرف چیخ نکلی بلکہ پلیٹ بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"کیا ہُوا؟" امّی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بِلّی کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔"

بس ڈر کا لفظ سُنتے ہی سب بھائی لگے اپنی اپنی بولیاں بولنے۔ وہ سب خود کو بہادُر اور مجھے بزُدل ثابت کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اب قریشی صاحب آئے تو اُمّید بندھی کہ اور مزہ آئے گا اور کوئی نہ کوئی قصّہ ضرور سُننے کو ملے گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ قریشی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پہلے تو اِس بات کی وضاحت کی کہ اِنسان ڈرتا کیوں ہے، اور پھر بتایا کہ یہ ڈر یا خوف کیسے کیسے تماشے دکھاتا ہے۔ اور پھر ثبوت میں یہ واقعہ سُنایا۔

"ایک روز چند دوستوں کے ساتھ مچھلی کے شکار کا پروگرام بنا۔ موسم بہُت اچھّا تھا۔ لٰہذا کیمپنگ اور پِک نِک کا سامان ساتھ لے لیا گیا۔ کیمپ دریا کے کنارے سے ذرا ہٹ کر لگایا گیا۔ کچھ لوگ پانی میں ڈور ڈال کر مچھلیاں پکڑنے لگے، باقی تاش کھیلنے یا ریڈیو سُننے لگے۔ جب مچھلی ہاتھ آتی تو اُسی وقت بھُون کر مزے سے اُڑائی جاتی۔ غرض جنگل میں منگل کا سا سماں تھا۔

"ہماری جنگل میں یہ دوسری رات تھی۔ کھانے کے بعد

کافی دیر گپ شپ ہوتی رہی اور پھر سب اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ صرف ایک آدمی پہرے کے لیے جاگتا رہا۔ کچھ فاصلے پر آگ جل رہی تھی تاکہ کوئی جنگلی جانور کیمپ کے قریب نہ آئے۔

"رات کے کسی پہر اچانک میری آنکھ کُھل گئی۔ آگ جانے کب کی بُجھ چکی تھی۔ پہرا دینے والا ساتھی بھی شاید اُونگھ گیا تھا۔ اِس اندھیرے اور خاموشی میں دریا کی لہروں کی آوازیں ماحول کو ڈراؤنا بنا رہی تھیں۔ میں نے کروٹ بدل کر سونا چاہا تو اچانک چھُن چھُن کی آواز آئی۔ میں چونک گیا۔ الٰہی! خیر۔ اِس ویرانے میں یہ گھُنگرُو بجنے کی آواز کیسی؟ آواز ذرا دیر رُکی اور پھر آنے لگی۔ کبھی قریب آتی، کبھی دُور چلی جاتی۔

"میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ پہرا دینے والا ساتھی بھی اب ہوشیار ہو چکا تھا اور کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دُور دُور بکھرے ہوئے ٹیلوں پر اُگے اِکّا دُکّا درخت ساکت و جامد سائے سے محسوس ہو رہے تھے۔ چھُن چھُن کی آواز کبھی تو کانوں پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگتی اور کبھی ایک دم سنّاٹا چھا جاتا۔ میرے تو اعصاب چٹخنے لگے۔ آخر میں نے اپنے ایک دوست کو ہلا کر اٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد دوسرے لوگ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور بوّلقوں کی طرح ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔

ایک ساتھی کانپتی ہوئی آواز میں بولا "مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی چڑیل ناچ رہی ہے۔ ابھی لپکتی ہوئی آئے گی اور ہم میں سے کسی کا گلا دبوچ لے گی۔"

"چپ رہو!" دوسرا گھگھیا کر بولا "ہم نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہن رکھیں۔"

"بھلے مانس، کوئی چور ڈاکو یا جنگلی جانور ہوتا تو اُس سے نمٹ لیتے۔ بھوتنی سے کیسے نمٹیں؟" تیسرے نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اب تو سبھی کو ہر طرف چڑیلیں، بھوت اور بدروحیں ناچتی دکھائی دینے لگیں۔ درختوں کے سائے بھی بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔ پتا بھی کھڑکتا تو لگتا کہ چڑیل آن پہنچی۔ سبھی دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے، مگر نہ تو وہ چھن چھن کی منحوس آواز ختم ہوتی تھی اور نہ کوئی سامنے آتا تھا۔ ہم لوگوں کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اِس ویرانے میں رات گئے کوئی زندہ عورت تو ناچنے سے رہی۔ یا اللہ! پھر یہ کیا اسرار ہے؟ اِسی اُدھیڑبُن میں پوری رات گزر گئی۔ خدا خدا کر کے اندھیرا چھٹا اور صبح کی دھندلی سی لکیر اُفق پر نمودار ہوئی۔

"صبح کا وقت کچھ ایسا پاکیزہ اور نورانی ہوتا ہے کہ رات کے سب خوف اور وسوسے خود بخود دلوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ گھنگروؤں کی آوازیں تو بدستور آتی رہیں مگر ہمارا خوف جاتا رہا۔ ایک دوست جھنجلا کر کہنے لگا "کیا مصیبت ہے! چلو، اُٹھ کر دیکھتے ہیں کہ اِس ویرانے میں کون گھنگھرو بجا رہا ہے۔"

سبھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے لاٹھی پکڑی، کسی نے بنسی، کسی نے چاقو سنبھال لیا، اور چلے اُس آواز کی جانب۔ آواز ایک ٹیلے کے پیچھے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ سب کلمہ پڑھتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ اور جب چوٹی پر پہنچ کر ڈرتے ڈرتے دوسری طرف دیکھا تو......؟

"دھت تیرے کی! کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا۔ سب نے

اپنے اپنے ہتھیار پھینکے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"ساری رات جس چڑیل سے ڈرتے کانپتے رہے تھے وہ ایک اونٹنی نکلی، جس کی گردن میں بندھے ہوئے پٹے میں گھنگرو جڑے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنی لمبی گردن کو خم دے کر ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی کی طرف منہ بڑھاتی تو گھنگرو چھن چھن بجنے لگتے۔

"اتنے میں سامنے سے چند دیہاتی آتے دکھائی دیے۔ اونٹنی کو دیکھتے ہی انہوں نے اس کو گھیرے میں لے لیا اور پھر ایک دیہاتی نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔

"کیوں، صاحب، یہ آپ کی اونٹنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ماری (ہماری) ہی ہے" اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ اِسے رات کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، جی۔ آج کل ذرا شوخ ہو رہی ہے۔ رات رسا تڑا کر بھاگ نکلی۔ میں نے کہا، جائے گی کہاں، اِنہی ٹیلوں ماں (میں) پھرتی پھرے گی۔ صبح کو پکڑ لیویں گے۔ پر آپ کیوں پوچھو ہو؟"

"جی، اس نے تو ہمیں ساری رات سونے ہی نہیں دیا۔" یہ کہہ کر میں نے ساری بات بتائی تو دیہاتی ہنس پڑے۔ تو بھئی، یہ ہے ہمارے خوف کی حقیقت۔ دراصل ڈر انسان کے اندر ہوتا ہے۔ جبھی اندھیرے میں گھنگرو بجیں تو چڑیل ناچتی دکھائی دیتی ہے اور سائے ہلیں تو جن بھوت محسوس ہوتے ہیں۔"

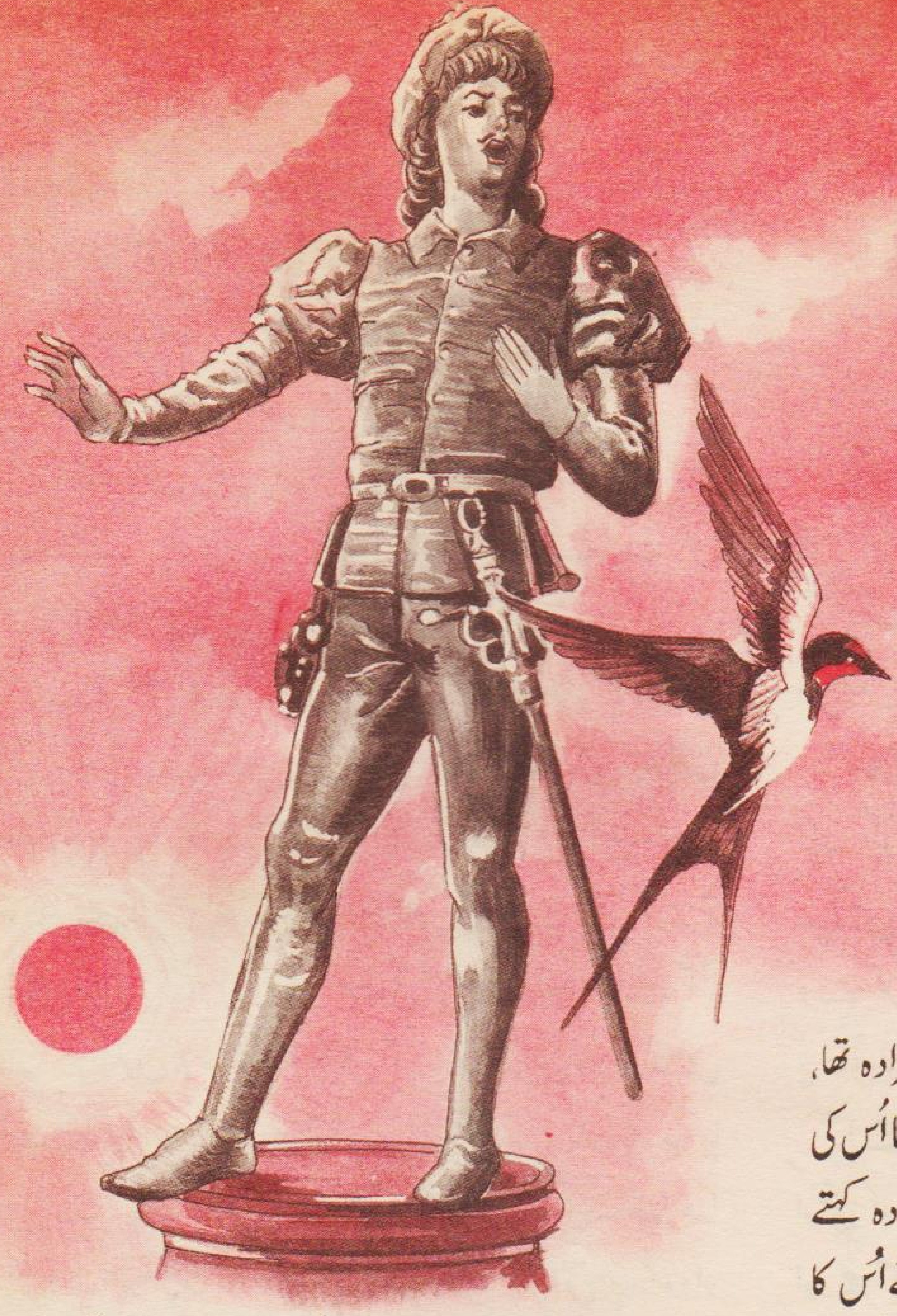

# سُکھی شہزادہ

آسکر وائلڈ
ترجمہ: تسنیم احمد خان

پُرانے زمانے کی بات ہے، کسی ملک میں ایک شہزادہ تھا، بے حد رحم دِل، نیک اور ہنس مُکھ۔ بات بات پر مسکرانا اُس کی عادت تھی۔ بچّے، جوان اور بوڑھے اُسے سُکھی شہزادہ کہتے تھے۔ جب وہ اِس دُنیا سے رُخصت ہُوا تو شہر والوں نے اُس کا ایک خوب صورت مُجسّمہ بنوایا اور شہر کے سب سے اُونچے مینار پر لگا دیا۔ مُجسّمے پر سونے کے پترے منڈھے ہوئے تھے، اُس کی آنکھیں نیلم کی تھیں اور تلوار کے دستے پر سُرخ یاقوت لگا ہوا تھا۔

ایک روز شام کے وقت، ایک ننّھا ابابیل شہر کے اِرد گِرد چکّر کاٹ رہا تھا۔ شام کی سیاہی سورج کی سُنہری کرنوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہی تھی۔ دن بھر کے تھکے ہارے پرندے اپنے اپنے بسیروں کو واپس آ رہے تھے۔ ننّھا ابابیل بھی کسی بسیرے کی تلاش میں تھا۔ اُس کے دوسرے ساتھی کئی ہفتے پہلے مصر جا چکے تھے۔ وہ بار بار شہر کے چکّر کاٹتا اور پھر آسمان میں کھو جاتا۔ آخر کافی عرصہ گھومنے کے بعد اُس کی نظر شہزادے کے مُجسّمے پر پڑی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ اُس کی خوشی سے باچھیں کِھل گئیں۔ ایک ہی اُڑان میں مُجسّمے کے پاس جا پہنچا اور اُس کے سُنہری پیروں میں ڈیرا جما لیا۔

تھکا ہوا تو تھا ہی، نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُس نے ایک ہلکی سی جُھرجُھری لی اور اپنا سر پروں میں چھپا لیا۔ ابھی نِندیا رانی اُسے تھپک تھپک کر سُلا ہی رہی تھی کہ اُوپر سے پانی کا ایک قطرہ اُس پر گرا۔

ابابیل ایک دم چونک اُٹھا۔ آسمان پر ننّھے ننّھے تارے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور بادلوں کا نام نشان تک نہ تھا۔

"عجیب بات ہے!" وہ بڑبڑایا "آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا تک نہیں۔ یہ بارش نہ جانے کہاں سے آن ٹپکی۔"

اِتنے میں پانی کا ایک اور قطرہ اُس کے اُوپر گرا۔ اِس مرتبہ وہ بہت سٹ پٹایا اور وہاں سے جانے کی ٹھان لی۔ وہ اُڑنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ ٹپ سے تیسرا قطرہ گرا۔ اُس نے حیران ہو کر اُوپر نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ شہزادے کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ چِھٹکی ہوئی چاندنی میں شہزادے کا چہرہ اِتنا پیارا معلوم ہو رہا تھا کہ ابابیل کو اُس پر پیار آ گیا۔

"تم کون ہو؟" ابابیل نے اُس سے پوچھا۔

"میں سُکھی شہزادہ ہوں" شہزادے نے جواب دیا۔

ابابیل نے کہا "لیکن تم رو کیوں رہے ہو؟"

شہزادے نے ابابیل کو اپنی کہانی سُنائی اور بڑی میٹھی آواز میں بولا "دُور، بہت دُور ایک تنگ و تاریک مکان میں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔ کپڑے سی سی کر اُس کے ہاتھ چھلنی ہو گئے ہیں۔ اُس کا بیٹا بخار میں کراہ رہا ہے اور اپنی ماں سے سنگترے مانگ رہا ہے۔ مگر بُوڑھیا غریب ہے۔ پانی کے سِوا اُس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اچھّے ابابیل، ننھّے ابابیل، تم میری تلوار کا سُرخ یاقوت اُکھاڑ کر اُسے دے آؤ۔"

ابابیل نے شہزادے کا حکم ماننے سے اِنکار کر دیا۔ کہنے لگا "میں تو مِصر جا رہا ہوں۔ وہاں میرے ساتھی میرا اِنتظار کر رہے ہوں گے۔"

شہزادے کو اِس جواب سے بے حد دُکھ ہوا۔ اُس کی رونی صورت دیکھ کر ابابیل کو ترس آ گیا۔ اُس نے سُرخ یاقوت اُکھیڑا اور بُڑھیا کی کُٹیا میں جا پہنچا۔ اُس کا لڑکا بُخار کی شِدّت سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ پاس ہی دن بھر کی تھکی ہوئی ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ پرندے نے یاقوت میز پر رکھ دیا

اور واپس شہزادے کے پاس لوٹ آیا۔

اگلے روز سورج طلوع ہوا تو ابابیل دریا پر نہانے گیا۔ آج رات اُسے مِصر جانا تھا، اور وہ اِس خیال سے بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس روز اُس نے شہر کے تمام بڑے بڑے مقامات کی سیر کی۔ اِدھر اُدھر خوب گھوما پھرا۔ رات کو جب چاند کی ٹکیا نیلے آسمان پر تیرنے لگی تو وہ واپس آیا اور شہزادے سے بولا "اچھّے شہزادے، آج میں مِصر جا رہا ہوں۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔"

شہزادہ کہنے لگا "ننھّے ابابیل، وہ دیکھو۔ شہر کے ایک مکان میں بھورے بالوں والا ایک نوجوان طالبِ عِلم سر جُھکائے کچھ لِکھ رہا ہے۔ سردی سے اُس کی اُنگلیاں اکڑ گئی ہیں۔ تم میری نیلم کی آنکھ اُسے دے آؤ تاکہ وہ اُسے بیچ کر اِیندھن خرید لے اور سردی سے بچ جائے۔"

ابابیل نہ مانا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادہ اپنی آنکھ کھو بیٹھے۔ لیکن چار و ناچار اُس کو شہزادے کا حکم ماننا ہی پڑا۔ اُس نے نیلم کی آنکھ چونچ میں دبائی اور نوجوان کو دے آیا۔

دوسرے دن ابابیل ساحل کی سیر کے لیے گیا اور شام ڈھلے واپس آ گیا۔ اُس رات بھی اُس نے مِصر جانے کے لیے اِصرار کیا، لیکن شہزادہ کہنے لگا "ننھّے دوست، تم ایک رات اور نہیں ٹھہر سکتے؟" ننھّے پرندے کا دل رُکنے کو چاہتا تو نہ تھا لیکن مجبورًا اُس نے ایک رات اور ٹھہرنے کا وعدہ کر لیا۔

اِس بار شہزادے نے اُسے ایک چھوٹی سی لڑکی دکھائی جو چوراہے پر کھڑی دِیا سلائیاں فروخت کر رہی تھی۔ اُس کی ساری دِیا سلائیاں گندے نالے میں گر گئی تھیں اور وہ اپنے باپ کے خوف سے رو رہی تھی۔ بے چاری کے پاؤں ننگے تھے اور سر پر دوپٹّا بھی نہ تھا۔ نیک دل شہزادہ بولا "ننھّے دوست، تم میری دوسری آنکھ نکال کر اِس لڑکی کو دے آؤ تاکہ وہ اپنے باپ کی مار سے بچ جائے۔"

مگر ابابیل نہ مانا۔ اُس نے چِلّا کر کہا "نہیں، نہیں۔ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ تم چاہتے ہو کہ ہمیشہ کے لیے اندھے ہو جاؤ؟"

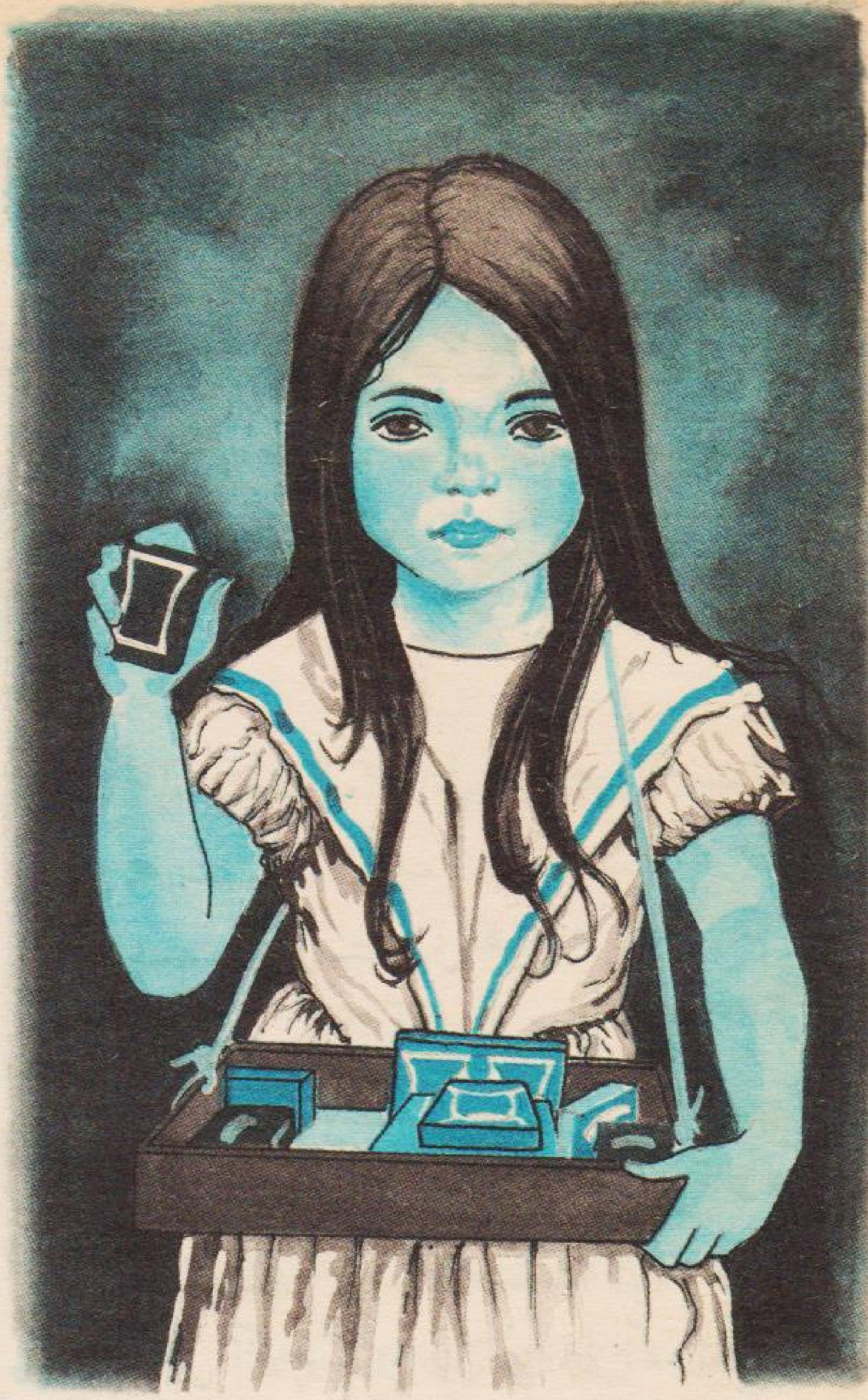

"تمہیں میرا حکم ماننا ہو گا" شہزادے نے کہا۔

آخر پرندے نے شہزادے کی دوسری آنکھ بھی نکال لی اور لڑکی کی جھولی میں ڈال آیا۔

اب شہزادہ اپنی دونوں آنکھیں کھو چکا تھا، اِس لیے ابابیل نے پکّا اِرادہ کر لیا کہ وہ زندگی بھر اپنے نیک سیرت دوست کے پاس رہے گا۔

روز کی طرح دوسرے دن بھی ابابیل شہر میں گھومنے پھرنے گیا۔ اُس نے دیکھا کہ امیر لوگ عالی شان مکانوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور غریب لوگ بوسیدہ جھونپڑوں میں پڑے فاقوں سے دم توڑ رہے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واپس آ کر اُس نے شہزادے کو یہ واقعہ سُنایا تو وہ بولا "میرے جسم پر سونا مڑھا ہوا ہے۔ تم ایک ایک ٹکڑا چُنتے جاؤ اور میری قوم کے تمام غریب اور مُفلِس انسانوں میں تقسیم کر دو۔"

ابابیل ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا سونے کا ٹکڑا اپنی چونچ میں دباتا اور غریبوں کی جھولیوں میں ڈال آتا۔ ہوتے ہوتے شہزادے نے اپنی ہر چیز قُربان کر دی۔ اُس کی قربانی سے سُوکھے ہوئے چہروں پر رونق آ گئی، روتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی مگر خود اُس کا جسم روز بروز کم زور اور لاغر ہوتا گیا۔

اُس روز بڑے زور کی آندھی آئی۔ اولے برسے۔ شہر کے گلی کوچے برف سے اَٹ گئے۔ ننھّے ابابیل کا جسم سردی سے ٹھٹھرنے لگا۔ مگر اُس نے شہزادے کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر اُس نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔

"خدا حافِظ! پیارے شہزادے" اُس نے مدّھم آواز میں کہا "لو، میں جا رہا ہوں ...... " یہ کہہ کر وہ بڑی مشکل سے شہزادے کے کاندھوں تک پہنچا، اُس کے لبوں کو چُوما اور پھر اُس کے قدموں میں گر کر ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو گیا۔

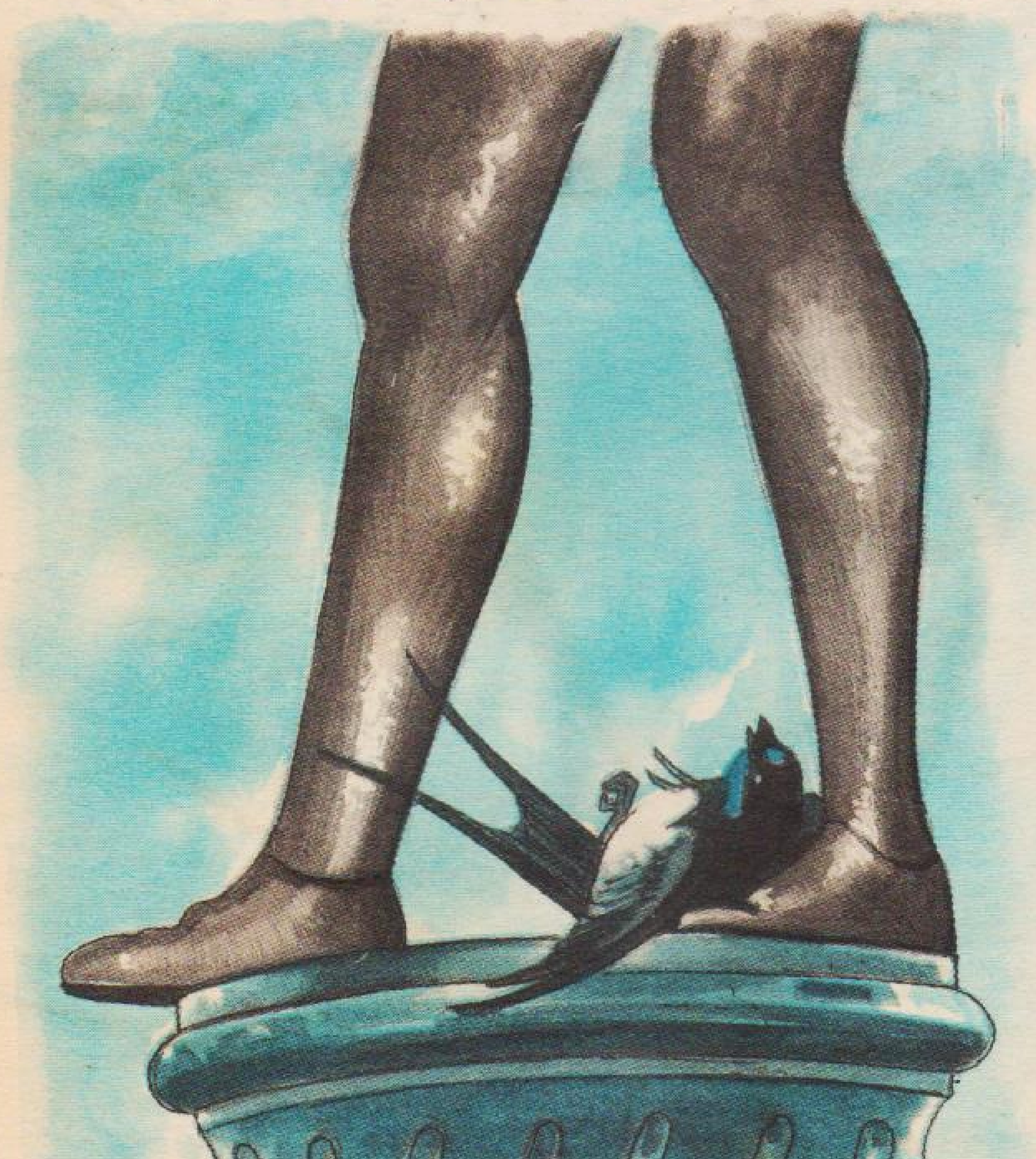

# 23 مارچ

گاؤ گیت خوشی کے گاؤ
یومِ پاکستان مناؤ

اپنے پیارے پاک وطن کی
آج کے دِن بُنیاد پڑی تھی
آج کا دن تاریخی دن ہے
سب نے جس کی کوشش کی تھی

گاؤ گیت خوشی کے گاؤ
یومِ پاکستان مناؤ

اِس میں ہر سُو خوش حالی ہے
کھیتوں کھیتوں ہریالی ہے
دریاؤں کا پانی چاندی
قُدرت اِس کی رکھوالی ہے

گاؤ گیت خوشی کے گاؤ
یومِ پاکستان مناؤ

قائد کے فرمان نہ بھولو
اللہ کا اِحسان نہ بھولو
مِل جُل کر سب رہنا سیکھو
یک(1) جہتی کی شان نہ بھولو

گاؤ گیت خوشی کے گاؤ
یومِ پاکستان مناؤ

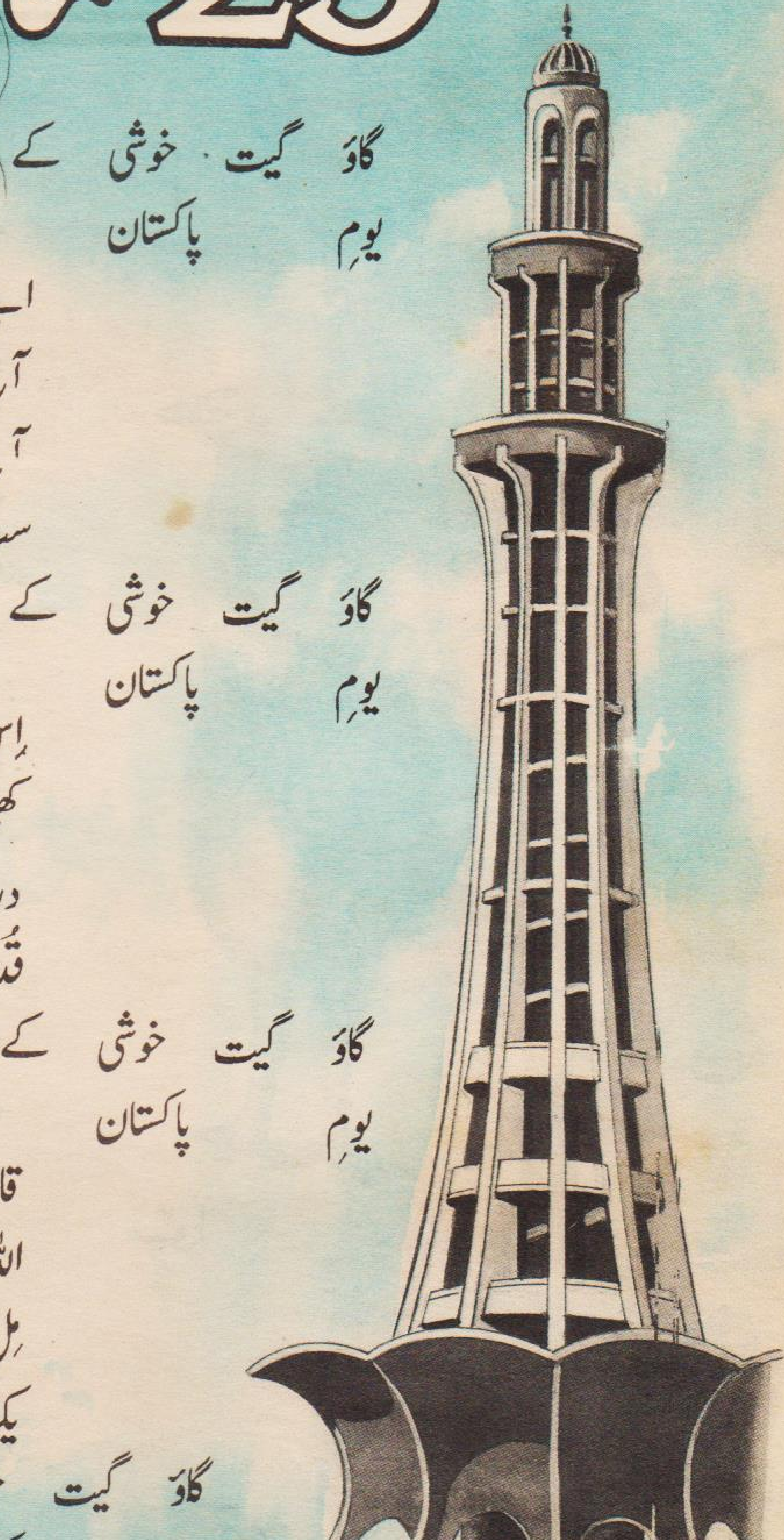

ضیاءُ الحسن ضیا

(1) اِتحاد۔ اِتفاق

# جانور جو ناپید ہو گئے!

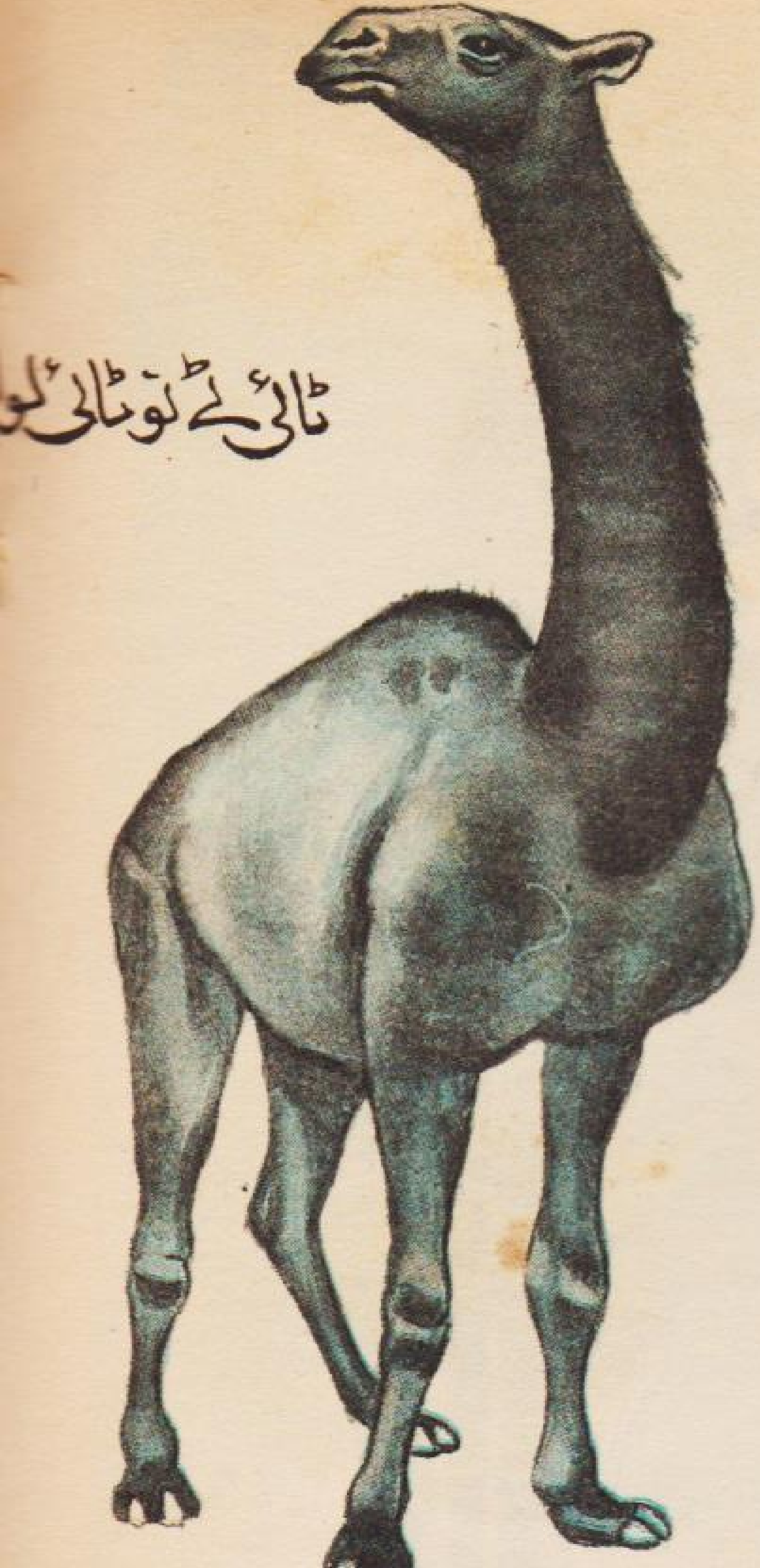

دُنیا میں پائے جانے والے جان دار ہمیشہ سے ایسے ہی نہ تھے جیسے آج دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتے رہے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں پہاڑ جیسے جانور، جنھیں ڈائنو سار کہتے ہیں، پائے جاتے تھے۔ پھر ایسا ہُوا کہ وہ دنیا کے تختے سے ناپید ہو گئے، اور اُن کی جگہ دوسرے جانوروں نے لے لی۔

دنیا میں یہ تبدیلی، یہ اَدل بَدل، کروڑوں سال سے ہو رہا ہے اور جب تک دنیا قائم ہے، ہوتا رہے گا۔ آج سے دس بارہ لاکھ سال بعد ممکن ہے کہ اِس وقت کے بہُت سے جان دار ناپید ہو جائیں اور اِن کی جگہ دوسرے جاندار پیدا ہو جائیں۔

دنیا سے جانداروں کے مِٹنے کی کئی وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو آب و ہوا ہے۔ یعنی ایک جاندار جس آب و ہوا میں رہنے کا عادی تھا، وہ ایک دم بدل گئی اور وہ جاندار اِس تبدیلی کی تاب نہ لا کر مَر مِٹ گیا۔ دوسری وجہ جانداروں میں اپنا بچاؤ کرنے کی قوّت کا نہ ہونا ہے۔ کئی جاندار ایسے تھے جنھیں قُدرت نے اِتنی طاقت نہیں دی تھی کہ وہ اپنے آپ کو دُشمنوں سے بچا سکیں۔ اِس لیئے اُن کی نسل آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جب کوئی جاندار بڑھتے بڑھتے ترقّی کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے، اور اُس سے آگے ترقّی کرنا ممکن نہیں ہوتا تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہاتھی اور وہیل کے مُتعلّق سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ جانور ترقّی کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں، اِس لیے اِن کی نسل رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔

مُوا

"مُوا" شتر مرغ کی طرح کا ایک پرندہ تھا اور نیوزی لینڈ میں پایا جاتا تھا۔ شُتر مُرغ کی طرح یہ بھی اُڑ نہیں سکتا تھا لیکن دوڑتا بہُت تیز تھا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زلزلوں، سیلابوں، جنگلوں کی آگ اور قحط کی وجہ سے اِس پرندے کی نسل ناپید ہو گئی۔ بحرِ ہند

آک

میک راچینیا

جائنٹ سلاتھ

کے جزیرہ ماریشس میں بطخ جیسا ایک بھدا سا جانور پایا جاتا تھا، جو بہت مسکین اور بھولا بھالا تھا۔ جب پُرتگالی جہازران اِس جزیرے میں پہنچے تو اُنھوں نے اِس جانور کا نام "ڈوڈو" رکھ دیا۔ ڈوڈو پُرتگالی زبان میں بے وقوف کو کہتے ہیں۔ یہ نہ تو اُڑ سکتا تھا اور نہ تیز دوڑ سکتا تھا۔ لوگ آسانی سے اِسے پکڑ لیتے تھے۔ پُرتگالیوں نے اِسے اپنا من بھاتا کھاجا بنالیا اور آخر آج سے تین سو سال پہلے یہ جانور بالکُل ختم ہو گیا۔

ایک اور عجیب و غریب پرندہ جس کا نام "آک" تھا، گرین لینڈ اور نیوفاؤنڈلینڈ میں پایا جاتا تھا۔ اِس کی شکل پنگوئن سے مِلتی جُلتی تھی۔ قُدرت نے نہ تو اِس کو اُڑنے کی طاقت دی تھی اور نہ اپنا بچاؤ کرنے کی۔ اِس لیے اِس کی نسل بھی ختم ہو گئی۔

یہی حال امریکا کے کئی اور جانوروں کا ہُوا۔ کسی زمانے میں امریکا میں دیو جیسا ایک جانور Giant Sloth پایا جاتا تھا۔ یہ اب بالکُل ناپید ہے۔ ایک اور امریکی جانور جسے سائنس دانوں نے "میک راچینیا" کا نام دیا ہے، دنیا کے تختے سے مِٹ چکا ہے۔ مشہور سائنس دان ڈارون کو جنوبی امریکا میں اِس کی ہڈیاں ملی تھیں۔ "پائی روتھے رِیم" نام کا ایک جانور، جو ہپّو پوٹے مَس اور ہاتھی سے مِلتا جُلتا تھا، جنوبی امریکا میں پایا جاتا تھا، اب ناپید ہے۔ اُونٹ جیسا ایک جانور "ٹائی ٹے نو ٹائی لو پَس" قدیم زمانے میں جنوبی امریکا کے جنگلوں میں کثرت سے ملتا تھا، اب بالکل ناپید ہے (س۔ ل)

پائی روتھے ریم

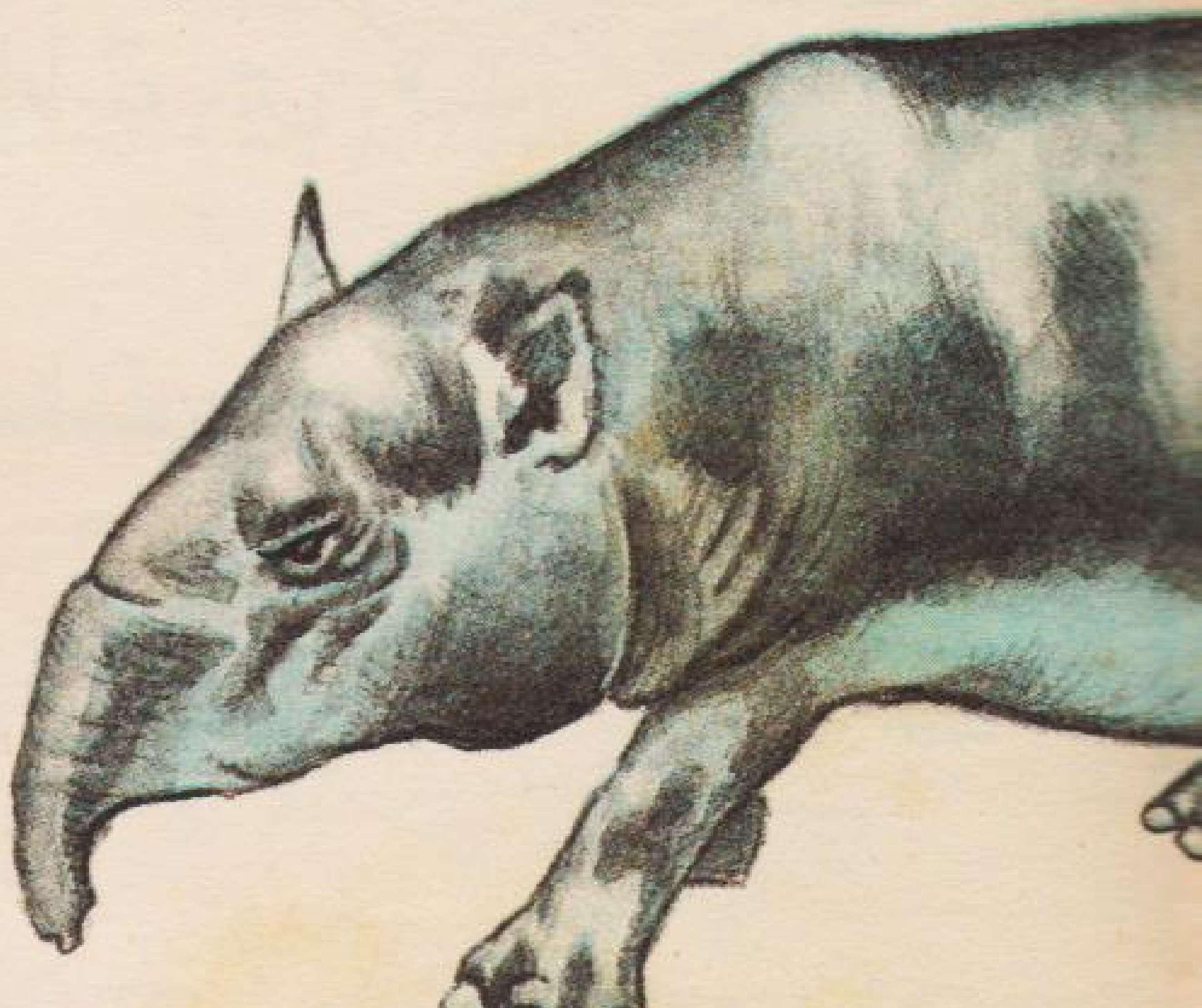

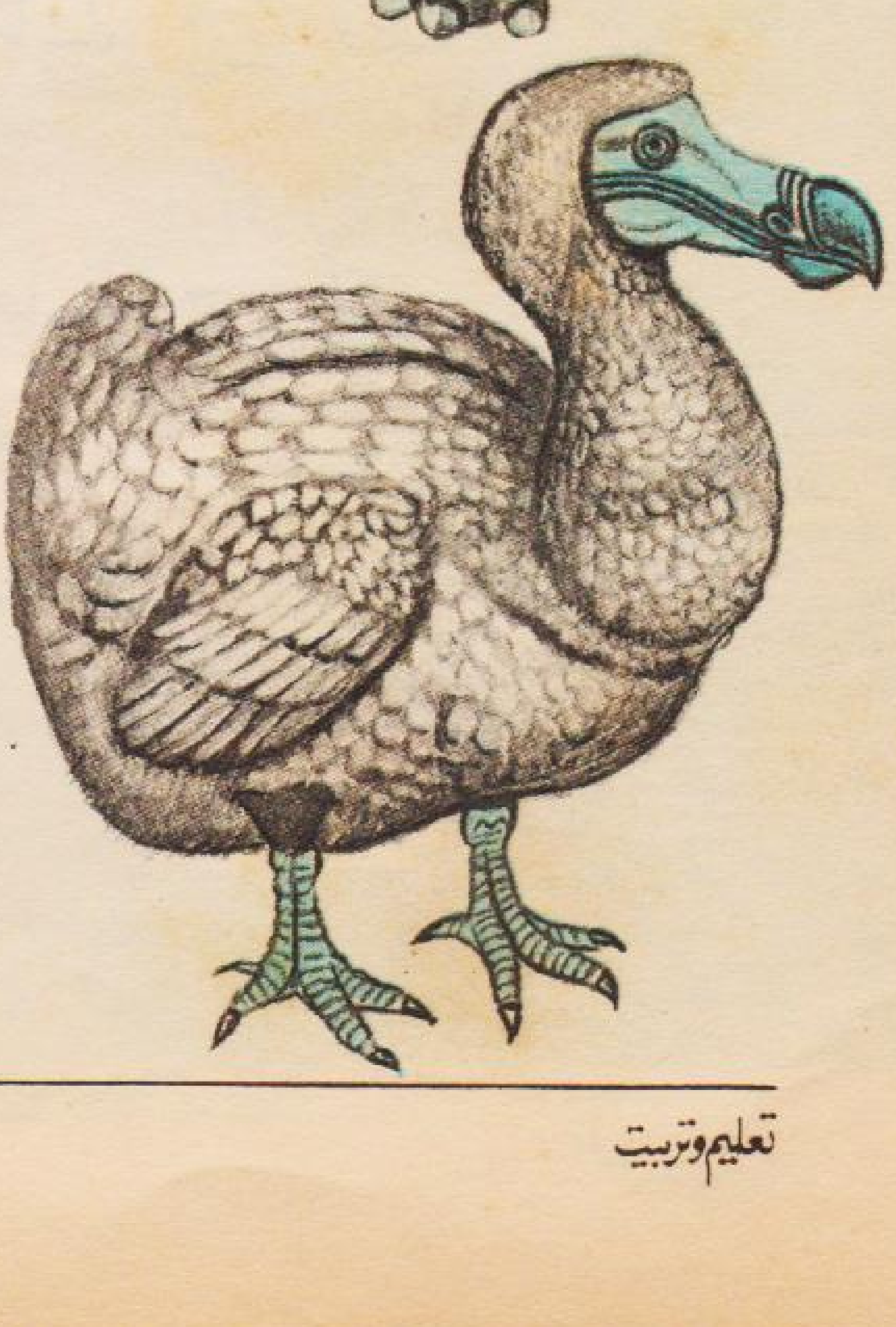

ڈوڈو

# کوّے

کسی گھر کی چھت پہ جب آتے ہیں کوّے
بہُت شور، مِل کر، مچاتے ہیں کوّے

عجب کائیں کائیں کی ہے اُن کی بولی
اِسی شور سے مغز کھاتے ہیں کوّے

اگر کھانے پینے کی شے کوئی دیکھیں
تو پھر کس طرح دندناتے ہیں کوّے

اُنھیں جب پکڑنے کی کوشش کرو تم
تو پُھرتی سے پھر بھاگ جاتے ہیں کوّے

شرارت پہ آ جائیں جس دَم یہ ظالم
تو چِڑیوں کو کتنا ستاتے ہیں کوّے

یہ دیکھو تو، کتنے بُرے جانور ہیں
کہ مُردار کو نوچ کھاتے ہیں کوّے

کئی لوگ ایسے بھی دیکھے ہیں بزمی
جو بے کار بیٹھے اُڑاتے ہیں کوّے

خالِد بزمی

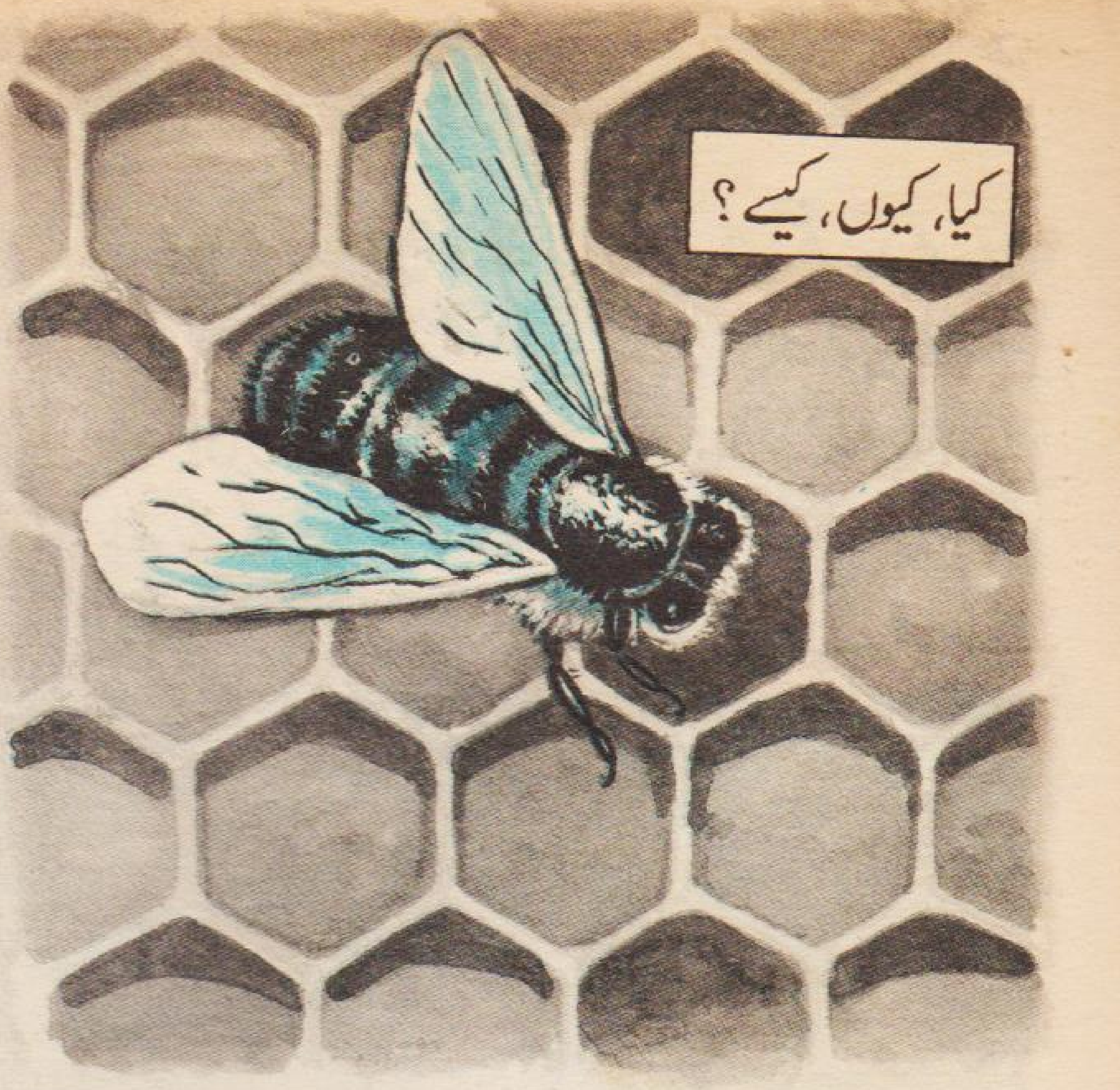


## شہد کی مکھی موم کیسے بناتی ہے؟

شہد کی مکھیاں پھولوں کے رس سے شہد بناتی ہیں، اور شہد سے موم تیار کرتی ہیں۔

شہد کی مکھی کے پیٹ کے اندر آٹھ خانے ہوتے ہیں، جن میں خاص قسم کے غدود (گلینڈ) ہوتے ہیں۔ موم بنانے کے لیے شہد کی مکھی کچھ شہد کھا جاتی ہے۔ یہ شہد پیٹ کے اِن خانوں میں پہنچتا ہے تو اِن میں موجود غدود اِس کو موم میں بدل دیتے ہیں۔ یہ موم اُس کے پیٹ میں سے رِس رِس کر باہر نکلتا ہے۔ شہد کی مکھی اُسے پیروں سے کھرچ کر مُنہ میں ڈالتی ہے اور پھر مُنہ سے موم نکال نکال کر چھتّا تیار کرتی ہے۔

چھتّے میں، چھ گوشوں والے، بہُت سے خانے ہوتے ہیں۔ بعض خانوں میں شہد اور زرِگُل جمع کیا جاتا ہے، اور بعض میں شہد کی مکھیاں رہتی ہیں۔ چند خانے ملکہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ وہ اِن خانوں میں انڈے دیتی ہے۔

## بحیرۂ مُردار کیا ہے؟

بحیرۂ مُردار ایک بڑی سی نمکین جھیل ہے جو دو ملکوں، شرقِ اُردن اور اِسرائیل کے درمیان واقع ہے۔ پُرانے زمانے کے یُونانیوں نے اِسے بحیرۂ مُردار (Dead Sea) کا نام دیا، یہودیوں نے اِسے "نمکین سمُندر" کہا اور عربوں نے اِسے "ڈبونے والے سمُندر" کے نام سے پُکارا۔

یہ جھیل یا بحیرہ (یعنی چھوٹا سمُندر) 48 میل لمبا اور 3 سے 11 میل تک چوڑا ہے اور دنیا میں پانی کا سب سے نیچا عِلاقہ ہے۔ اِس کی سطح سمُندر کی سطح سے 400 میٹر نیچی ہے۔ جنوبی حصّہ بہُت کم گہرا ہے، لیکن شِمال میں گہرائی تقریباً 400 میٹر ہے۔

اِس بُحیرے میں سے کوئی دریا نہیں نکلتا، لیکن شِمال کی طرف سے دریائے اُردن آ کر اِس میں گرتا ہے۔ اِس کے عِلاوہ کئی چھوٹے موٹے چشمے بھی اِس میں گرتے ہیں۔ اِس کے فالتو پانی کے نِکاس کا صِرف ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ ہے عملِ تبخیر (Evaporation) - دریا اور چشموں کا پانی تو بھاپ بن کر اُڑتا رہتا ہے، لیکن اُس میں جو معدنیات مثلاً نمک، پوٹاش، میگنیشیم کلورائڈ اور برومائن ہوتی ہیں، وہ نیچے ہی رہ جاتی ہیں۔ یہ عملِ مُدّتوں سے جاری ہے۔

بحیرۂ مُردار دنیا کا سب سے زیادہ نمکین سمُندر ہے۔ اِس کا پانی کسی بھی بحر یعنی بڑے سمُندر سے زیادہ نمکین ہے۔ اِس میں اِتنی معدنیات ہیں کہ اگر آپ اِس میں تیریں تو، پانی گاڑھا ہونے کی وجہ سے، آپ کا سر اور کندھے پانی کے اُوپر ہی رہیں گے، ڈُوبیں گے نہیں۔ یہ معدنیات اِنسان کے بہُت کام آ سکتی ہیں۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اِس بُحیرے کے پانی میں 20 لاکھ ٹن پوٹاش موجود ہے، جس سے مصنوعی کھاد بنائی جا سکتی ہے۔

## کیا بحیرۂ مُردار میں کوئی جان دار پایا جاتا ہے؟

بحیرۂ مُردار دنیا کا عجیب و غریب سمُندر ہے۔ لاکھوں سال قبل یہ سمندر، آج کل کے مقابلے میں، 420 میٹر اونچا تھا اور اِس کی سطح بحیرۂ رُوم کی سطح سے بلند تھی۔ اُن دنوں اِس سمُندر میں مچھلیاں وغیرہ پائی جاتی تھیں۔ لیکن پھر خُشک سالی کا ایک لمبا عرصہ آیا۔ سال ہا سال تک بارشیں نہیں ہوئیں، جس سے اِس کا بہُت سا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا اور کچھ مُدّت بعد یہ سمُندر اِتنا رہ گیا جتنا آج ہے۔

دوسرے تمام سمندروں کے پانی میں 4 سے 6 فی صد تک نمک ہوتا ہے، لیکن بحیرۂ مُردار کے پانی میں نمک کی مقدار 23 سے 25 فی صد تک ہے۔ آپ اس کا ایک قطرہ بھی زبان پر رکھیں گے تو اُبکائی آ جائے گی۔ چوں کہ اِس میں میگنیشیم کلورائڈ کے عِلاوہ کیلسیم کلورائڈ بھی پائی جاتی ہے، اِس لیے اِس کا پانی چکنا ہے۔

غیر معمولی کھاری ہونے کی وجہ سے اِس بحیرے میں کوئی جان دار زندہ نہیں رہ سکتا۔ اِس لیے یہاں نہ تو مچھلیاں ہیں اور نہ پانی کی کوئی اور مخلوق۔ بعض وقت دریائے اُردن اپنے ساتھ کچھ مچھلیاں بہا کر لے آتا ہے، لیکن وہ بحیرۂ مُردار میں آتے ہی مر جاتی ہیں۔ اِن مُردہ مچھلیوں کو پرندے کھا جاتے ہیں۔

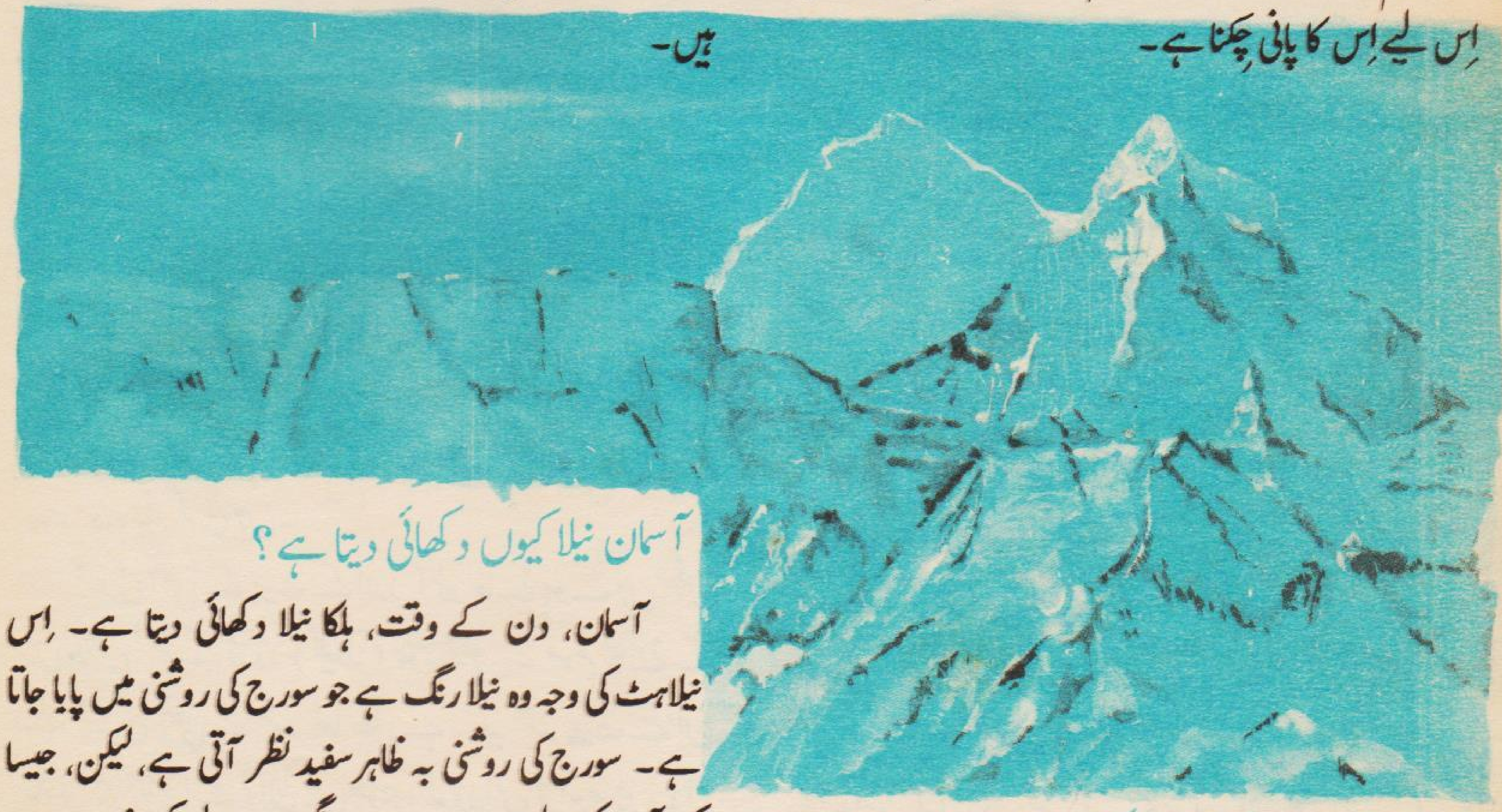

## آسمان نیلا کیوں دکھائی دیتا ہے؟

آسمان، دن کے وقت، ہلکا نیلا دکھائی دیتا ہے۔ اِس نیلاہٹ کی وجہ وہ نیلا رنگ ہے جو سورج کی روشنی میں پایا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی بہ ظاہر سفید نظر آتی ہے، لیکن، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یہ سات رنگوں سے مِل کر بنی ہے۔ یہ ساتوں رنگ دھنک میں نظر آتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب سورج کی روشنی زمین کی فضا میں داخل ہوتی ہے تو فضا یعنی ہَوا اِس روشنی کے کچھ حصّے کے رنگوں کو مُنتشر کر دیتی ہے (یعنی اِن رنگوں کو الگ الگ کر کے فضا میں بکھیر دیتی ہے)۔ اِن میں سے نیلا رنگ زیادہ مُنتشر ہوتا ہے، اور اِسی وجہ سے آسمان نیلا دکھائی دیتا ہے۔

زمین سے 100 میل (160 کلومیٹر) اُوپر تک آسمان کا رنگ نیلا ہی نظر آئے گا۔ اِس کے بعد جوں جوں ہم اُوپر جائیں گے، ہَوا ہلکی ہوتی جائے گی اور آسمان کا رنگ سیاہ ہوتا جائے گا۔ زمین سے 200 میل اُوپر ہَوا بالکُل ختم ہو جاتی ہے۔ اِس "جگہ" کو خلا کہتے ہیں۔ یہاں سے آسمان بالکل کالا سیاہ دکھائی دیتا ہے، کیوں کہ ہَوا نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سورج کی روشنی مُنتشر نہیں ہوتی (س۔ل)

## دُنیا کا سب سے اُونچا پہاڑ کون سا ہے؟

زمین کی سطح پر پائے جانے والے پہاڑوں میں ماؤنٹ ایورسٹ (Everest) دنیا کا سب سے اُونچا پہاڑ ہے۔ یہ، ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں، تبّت اور نیپال کی سرحد پر واقع ہے، اور سطحِ سمندر سے تقریباً 29,028 فٹ بلند ہے۔

لیکن سچ پوچھیے تو سمندروں کے اندر ایورسٹ سے بھی اُونچے پہاڑ ہیں، اور اِن میں سے بعض پہاڑوں کی چوٹیاں، جو پانی سے باہر اُبھری ہوئی ہیں، جزیرے بن گئی ہیں۔ ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کی 50 ویں ریاست، جزیرہ ہَوائی، کا آتش فِشاں پہاڑ، مانا موآ، دراصل سمندر کے اندر واقع ایک پہاڑ کی چوٹی ہے۔ یہ پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ سے 4,500 فٹ زیادہ اونچا ہے، لیکن اِس کا صرف 13,796 فٹ حصّہ زمین کی سطح کے اُوپر ہے۔

روسی کہانی

# سات سال کی جان

دو بھائی پردیس گئے۔ ایک غریب تھا، دوسرا امیر۔ دونوں کے پاس ایک ایک سواری تھی۔ غریب کے پاس گھوڑی اور امیر کے پاس گھوڑا گاڑی ۔ چلتے چلتے رات ہو گئی۔ دونوں ایک جگہ ٹھہر گئے۔

رات کو غریب کی گھوڑی نے بچھیرا دیا۔ بچھیرا لُڑھک کر امیر کی گاڑی کے نیچے آ گیا۔ سویرا ہوتے ہی امیر بھائی نے اپنے غریب بھائی کو جگایا اور کہا:

"اُٹھو بھیّا، میری گاڑی کے رات بچھیرا ہُوا ہے۔"

غریب اُٹھ گیا اور بولا "بھلا گاڑی کے بھی کہیں بچھیرا ہوتا ہے؟ یہ تو میری گھوڑی کا معلوم ہوتا ہے۔"

"اگر اِس کا ہوتا تو اِسی کے پاس ہوتا" امیر بھائی نے کہا۔

دونوں میں جھگڑا ہُوا۔ بات کچہری تک پہنچی۔ امیر بھائی نے جج کو پیسہ دے کر اپنی طرف کر لیا۔ بے چارے غریب کے پاس سچّی بات کہنے کے سِوا کچھ نہ تھا۔

ہوتے ہوتے مُعاملہ بادشاہ زار کے پاس پہنچا۔ زار نے دونوں بھائیوں کو بُلایا اور چار پہیلیاں اُن سے بُجھوائیں۔ اُس نے پوچھا:

"بتاؤ، سب سے طاقت وَر اور تیز، سب سے موٹی، سب سے نرم اور سب سے پیاری چیز دُنیا میں کون سی ہے؟"

زار نے اُنہیں سوچنے کے لیے تین دن کی مُہلت دی۔ اُس نے کہا "چوتھے دن آؤ اور مجھے اپنے جواب بتاؤ۔"

امیر بھائی کچھ دیر سوچتا رہا۔ تب اُسے اپنی ایک رشتے دار عورت یاد آئی اور وہ اُس سے پوچھنے کے لیے چل پڑا۔

جب وہ عورت کے یہاں پہنچا تو اُس نے پیار سے اُسے بٹھایا، خوب آؤ بھگت کی، پھر پوچھا "تمھارا چہرہ کیوں اُترا ہُوا ہے؟"

"زار نے مجھ سے چار پہیلیاں بُوجھی ہیں اور تین دن کی مُہلت دی ہے" امیر بھائی بولا۔

"اچھا، تو بتاؤ، کیا پہیلیاں ہیں؟"

"پہلی پہیلی یہ ہے کہ دنیا میں سب سے طاقت ور اور تیز کون سی چیز ہے؟"

"واہ! یہ تو میرے شوہر کی گھوڑی ہے۔ اُس سے زیادہ طاقت ور اور تیز کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا چابک کا اِشارہ ہوا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔"

"اچھا، دوسری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے موٹی چیز کون سی ہے؟"

"واہ! یہ تو ہمارا سانڈ ہے۔ وہ اِتنا موٹا ہے کہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔"

"تیسری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے نرم چیز کون سی ہے؟"

"واہ! یہ تو میرا پروں والا بستر ہے۔ میں نے خواب میں بھی اِس سے نرم چیز کوئی نہیں دیکھی۔"

"خیر، آخری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے پیاری چیز کون سی ہے؟"

"میرا پوتا، ایوانوشکا۔ اُس سے بڑھ کر پیارا کون ہو سکتا ہے، بھلا۔"

"خدا تمھیں خوش رکھے، نیک بی بی۔ میں اب سمجھ گیا کہ مجھے بادشاہ کو کیا بتانا چاہئیے" امیر بھائی نے کہا۔

اب بے چارے غریب بھائی کی سُنو۔ وہ روتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ دروازے پر اُسے اپنی سات سال کی بچّی ملی۔ وُہی اُس کا کُل خاندان تھا۔ اِس سات سال کی بچّی نے کہا:

"بابا، تم پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہے ہو؟"

"روؤں نہ تو کیا کروں؟ زار نے مجھ سے چار پہیلیاں بُوجھی ہیں، اور میں اُن کا جواب زندگی بھر نہیں دے سکتا۔"

"مجھے بتاؤ، پہیلیاں کیا ہیں؟" بیٹی نے پوچھا۔

"اچھا تو سُنو۔ سب سے زیادہ طاقت ور اور تیز، سب سے موٹی، سب سے نرم اور سب سے پیاری چیز دنیا میں کون سی ہے؟"

"زار کے پاس جاؤ بابا، اور کہ دو کہ سب سے طاقت ور اور تیز چیز آندھی ہے۔ سب سے موٹی زمین ہے، کیوں کہ جو چیزیں بھی زندہ رہتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں، اُن سب کو وہی کھلاتی پلاتی ہے۔ سب سے نرم ہاتھ ہے، کیوں کہ آدمی چاہے جس چیز پر بھی لیٹے، سر کے نیچے ہمیشہ اپنا ہی ہاتھ رکھتا ہے۔ اور دنیا میں سب سے پیاری چیز نیند ہے۔"

تب دونوں بھائی زار کے پاس پہنچے۔ زار نے اُن کی بات سُنی۔ پھر اُس نے غریب سے پوچھا:

"یہ جواب تم نے خود سوچے ہیں یا کسی نے تمھیں بتائے ہیں؟"

"حضُور، میری ایک بیٹی ہے، سات سال کی۔ اُسی نے مجھے یہ جواب بتائے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا "اگر تمھاری بیٹی اِتنی ہی عقل مند ہے تو یہ تھوڑا سا ریشم لے جاؤ اور اُس سے کہو کہ میرے لیے ایک بڑھیا سا تولیہ کل صبح تک بُن دے۔"

غریب نے ریشم لے لیا اور پریشان، اُداس گھر پہنچا۔

"بڑی آفت آئی ہے، میری بیٹی" اُس نے کہا "زار کا حکم ہے کہ تُم اِتنے سے ریشم کا ایک تولیہ اُس کے لیے بُن دو۔"

"گھبراؤ مت، بابا" بیٹی نے کہا۔ پھر اُس نے جھاڑو کی ایک تیلی توڑ کر اپنے باپ کو دی اور کہا "اِسے زار کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ کوئی ایسا کاری گر ڈھونڈ دے جو اِس تیلی سے ایک کھڈّی بنا دے۔ اُس کھڈّی پر میں تولیہ بُن دوں گی۔"

غریب آدمی زار کے پاس پہنچا اور اپنی بیٹی کی بات کہ سُنائی۔ تب زار نے اُسے ایک سو پچاس انڈے دیے اور کہا:

"یہ 150 انڈے اپنی لڑکی کو دو اور کہو کہ کل صبح تک اِن میں سے 150 بچّے نکل آئیں۔"

وہ بے چارہ گھر آیا، اور بیٹی سے کہا "آہ میری بیٹی! ایک بلا ٹلی تو دوسری آئی" یہ کہ کر اُس نے ساری بات کہ

سنائی۔

"گھبراؤ مت، بابا" بیٹی نے کہا "میں ابھی اِس کا اِنتظام کرتی ہوں۔"

بیٹی نے سارے انڈے پکا کر دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے رکھ دیے۔ پھر اُس نے باپ سے کہا "زار کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ مرغی کے بچّوں کے کھانے کے لیے باجرہ چاہئیے۔ کھیت جوتا جائے، باجرہ بویا جائے، کاٹا اور صاف کیا جائے۔ سب کچھ ایک دن کے اندر ہو جائے۔ نہیں تو بچّے بھوکوں مر جائیں گے۔"

زار نے غریب آدمی کی پوری بات سُنی اور کہا،

"اگر تمہاری بیٹی اِتنی ہی عقل والی ہے تو اُس سے کہو، کل صبح یہاں آئے۔ نہ ننگی ہو، نہ بدن پر کپڑے ہوں۔ نہ پیدل ہو، نہ گھوڑے پر سوار۔ نہ ساتھ تحُفہ لائے اور نہ خالی ہاتھ آئے۔"

غریب آدمی نے سوچا "یہ کام تو میری بیٹی کے بس کا نہیں۔ اب تو آفت آئی کہ آئی۔"

لیکن سات سال کی بچّی نے کہا "گھبراؤ مت، بابا۔ شکاریوں کے پاس جاؤ اور میرے لیے ایک زندہ خرگوش اور ایک تیتر خرید لاؤ۔"

غریب آدمی ایک شکاری کے پاس گیا اور اُس سے ایک خرگوش اور ایک تیتر خرید لایا۔

دوسرے روز صبح سویرے اُس کی بیٹی نے اپنے کپڑے اُتارے، مچھلی پکڑنے کا جال بدن پر لپیٹا، تیتر ہاتھ میں لیا اور خرگوش کی پیٹھ پر سوار ہو کر محل کی طرف چل پڑی۔

زار اُسے محل کے پھاٹک پر ملا۔ لڑکی نے جُھک کر سلام کیا اور کہا "حضور، یہ آپ کے لیے تحُفہ ہے" اُس نے تیتر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ زار اُسے پکڑنے ہی والا تھا کہ وہ پھُر سے یہ جا وہ جا۔

"بہُت خوب!" زار نے کہا "تم نے ٹھیک ویسے ہی کیا جیسا میرا حکم تھا۔ اچھّا، اب یہ بتاؤ، میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ غریب ہے۔ وہ تمہارے کھانے کا کیا بندوبست کرتا ہے؟"

"میرا باپ سُوکھی زمین پر مچھلیاں پکڑتا ہے اور میں اُن کا مزے دار سالن پکاتی ہوں۔"

بادشاہ بولا "واہ ری، بے وقوف لڑکی! بھلا کہیں خشک زمین پر بھی مچھلیاں ہوتی ہیں؟ مچھلیاں تو پانی میں رہتی ہیں۔"

"اور آپ تو عقل مند آدمی ہیں، حضُور۔ آپ نے کسی گاڑی کے بچھیرا ہوتا دیکھا ہے؟ بچھیرا تو گھوڑی کے ہوتا ہے، گاڑی کے نہیں۔"

اِس پر زار لاجواب ہو گیا اور اُس نے بچھیرا غریب آدمی کو دِلوا دیا۔

---

# آپ جانتے ہیں؟

- ایک تن دُرست آدمی کا دِل ایک سال میں چار کروڑ بار دھڑکتا ہے۔
- چھوٹا بچّہ ایک مِنٹ میں 40 دفعہ سانس لیتا ہے۔ ایک جوان آدمی، جب وہ آرام سے لیٹا ہو، 13 سے 17 دفعہ، اور ورزش کر رہا ہو تو تقریباً 80 دفعہ سانس لیتا ہے۔
- امریکا کے 98 فی صد گھروں میں کم از کم ایک کلر ٹی وی ہے۔ دو تہائی گھروں میں دو یا دو سے زیادہ ٹی وی ہیں۔
- 1960ء میں امریکا کے ایک کاغذ ساز کارخانے نے کاغذ کے لباس تیار کیے تھے۔ لیکن لوگوں نے اُنہیں پسند نہیں کیا۔
- ہماری زمین کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے ڈھکا ہُوا ہے، لیکن اِس میں سے صرف ایک فی صد پینے کے قابل ہے۔

## تین خواہشیں

کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ ایک رات کسی نے اُس کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ کسان نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک بونا کھڑا تھا۔ بونے نے کہا "میں مُسافِر ہُوں۔ آج رات مجھے اپنے گھر سُلا لو۔ صبح چلا جاؤں گا۔"

کسان نے بونے کو کھانا کھلایا اور پھر اُسے اپنے بستر پر آرام سے سُلا دیا۔ صبح کو بونا جانے لگا تو اُس نے کہا "تم نے میرے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ مانگو، کیا مانگتے ہو؟ میں تمھاری تین خواہشیں پوری کر سکتا ہوں۔"

کسان بولا "مجھے بہُت سی دولت دے دو۔"

بونے نے کسان کا گھر سونے چاندی سے بھر دیا اور چلا گیا۔

ایک دن کسان نے اپنی بیوی سے کہا "ہمارے پاس اِتنی دولت ہو گئی ہے کہ میں اِس کا حساب بھی نہیں کر سکتا۔"

بیوی بولی "میری تو راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں چور ڈاکو نہ آ جائیں۔"

کچھ دن بعد بونا پھر آیا اور بولا "تمھاری ایک خواہش تو پوری ہو گئی۔ اب دوسری خواہش بتاؤ۔"

کسان نے کہا "یہ دولت واپس لے لو۔ ہمیں پھر ویسا ہی غریب بنا دو۔"

بونے نے کسان کی یہ خواہش بھی پُوری کر دی۔ وہ پھر پہلے کی طرح غریب ہو گیا۔ کچھ دن بعد بونا پھر آیا اور بولا "اب تمھاری ایک خواہش رہ گئی ہے۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

کسان نے کہا "پیارے بونے، تم ہمیں عقل کی دولت دے دو، تاکہ ہم بُرے بھلے کی پہچان کر سکیں۔"

بونا بہُت خوش ہوا۔ کہنے لگا "اب تم نے کام کی چیز مانگی ہے۔ اب تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی کیوں کہ تم ہر کام سوچ سمجھ کر کیا کرو گے۔"

## لومڑی اور بندر

شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شیر مر گیا۔ جنگل کے سارے جانوروں کو یہ فکر ہوئی کہ اب اُن کا بادشاہ کون بنے؟ ایک خرگوش کہنے لگا "بھئی، جس جانور کے سر پر تاج ٹھیک آ جائے، بس اُسی کو بادشاہ بنا دو۔"

جانوروں کو خرگوش کی یہ بات پسند آئی اور اب سارے جانوروں نے تاج سر پر رکھ کر دیکھنا شروع کیا کہ کس کے سر پر پورا آتا ہے۔

"اوہو! یہ تو میرے سر پر بہُت بڑا ہے" لومڑی بولی۔

"اور میرے لیے تو یہ بہُت ہی چھوٹا ہے" ہاتھی بولا۔

ہرن بے چارہ حسرت سے تاج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے سینگوں کی وجہ سے سر پر تاج نہیں رکھ سکتا تھا۔

بندر نے تاج پہنا تو اُس کے سر پر پورا آ گیا۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا اور تالی بجا کر بولا "میں تم سب کا بادشاہ ہوں۔"

لومڑی کو بندر کا بادشاہ بننا اچھا نہیں لگا۔ لومڑی تو چالاک ہوتی ہی ہے۔ وہ بندر کو ایک طرف لے گئی اور کہنے لگی "بادشاہ سلامت، مجھے ایک خزانے کا علم ہے۔ اب آپ ہمارے بادشاہ ہیں، اِس لیے میں اُس خزانے کا پتا آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔"

بندر کو بادشاہ بننے کی کیا کم خوشی تھی، اُس نے خزانے کا سُنا تو بالکُل ہی دیوانہ ہو گیا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے لومڑی کے ساتھ چل دیا۔

آگے جا کر جب بندر اور لومڑی اکیلے رہ گئے تو لومڑی نے بندر کو ایک گڑھے میں دھکّا دے دیا اور کہا "تم ہم سب پر حکومت کرنا چاہتے تھے لیکن تمھیں تو اپنے لالچ پر قابو پانا نہیں آتا۔"

دوسرے جانوروں نے بندر کا یہ حال دیکھا تو اُسے فوراً تخت سے اُتار دیا اور اپنے لیے نیا بادشاہ چُن لیا۔

دماغ لڑاؤ

# داؤدی علمی آزمائش

1 ۔ مُتوازِن غذا کسے کہتے ہیں؟

2 ۔ مُتوازِن غذا کن چیزوں سے حاصل کی جا سکتی ہے؟

3 ۔ ایک ہی قسم کی غذا کے بجائے مُختلف قسم کی غذائیں کیوں کھانی چاہئیں؟

4 ۔ سائنس دانوں نے غذاؤں کو کتنے گروپوں میں تقسیم کیا ہے؟

5 ۔ غذا ہمارے جسم کے کس عضو میں ہضم ہوتی ہے؟

6 ۔ کھانا کھانے کے بعد دس پندرہ مِنٹ آرام سے بیٹھے رہنا چاہیئے۔ کیوں؟

7 ۔ موٹے آدمی کو کس قسم کی غذا کھانی چاہیئے؟

8 ۔ اگر دُنیا کے تمام پودے (اور درخت) ناپید ہو جائیں تو اِنسان جانوروں کا گوشت کھا کر زِندہ رہ سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلَط؟

9 ۔ وائٹا من کس سائنس دان نے دریافت کیے تھے؟

10 مائک روب (Microbes) کیا ہیں اور اِن کی کتنی قِسمیں ہیں؟

ضروری نوٹ۔ مختصر جوابات لکھ کر بھیجیں۔ سوال لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔
حل کے ساتھ کوپن اچھی طرح پِن اَپ کریں۔

پہلا اِنعام (بالکل صحیح حل) 350 روپے کی کتابیں
دوسرا اِنعام (ایک غلطی) 300 روپے کی کتابیں
تیسرا اِنعام (دو غلطیاں) 200 روپے کی کتابیں
چوتھا اِنعام (تین غلطیاں) 150 روپے کی کتابیں

## جوابات علمی آزمائش فروری 1993

(1) پنجاب رجمنٹ (2) بریڈ فورڈ۔ یہاں پاکستانیوں کی اکثریت ہے (3) ہالینڈ (4) تھائی لینڈ (5) فارس (6) فلسطین (7) قُسطُنطنِیہ (8) اِبلیس کا (9) سیام (10) اُتنا ہی یعنی چار فٹ۔

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مارچ ہے

پتا ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ شارع بن بادیس لاہور۔

نام ________________ عُمر ____________

پتا ________________________________

اس ماہ 155 دوست تمام سوالوں کے درست جواب دینے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں سے شروع کے 12 ساتھیوں کو 30,30 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

عقیلہ اقبال گجرات۔ سیدہ طاہرہ مشتاق اسلام آباد۔ فلدان طاہر لاہور۔ حیات اللہ عاطش سرائے نورنگ۔ حمید احمد منڈی بہاؤالدین۔ عنبرین سعید لاہور۔ میمونہ قادر خاں ٹیکسلا۔ عرفان احمد لاہور۔ نصیر احمد برکی ارمسٹر میانہ پشاور۔ آمنہ سلطانہ بٹ راولپنڈی۔ زینب قمر لاہور۔ محمد حمزہ علیمی فیصل آباد۔

خالد ضیاء جنجوعہ لاہور۔ رمنا فیاض چغتائی فیصل آباد۔ مہ پارہ فیاض فیصل آباد۔ عمران جاوید لاہور۔ ناصر احمد سومرو فیصل آباد۔ فاطمہ اظہر لاہور۔ نعمان طارق سیالکوٹ۔ ماہ رخ اکرم لاہور۔ ذیشان پرویز سیالکوٹ۔ غلام دستگیر جاوید فیصل آباد۔ امتیاز حسین پھالیہ۔ عرفان اسلم لاہور۔ سلمان تقی کراچی۔ برہان رضی الدین کراچی۔ طارق حسین ملتان۔ خالد الیاس فیصل آباد۔ محمد عثمان جلالیہ۔ محمد طاہر جلالیہ اٹک۔ زاہد حسین سنجھورو۔ شمائل احمد فیصل آباد۔ سلمان خان پیپلز کالونی۔ شیر نواز گل تحصیل پشاور۔ وصفی خراسانی کراچی۔ سید ثاقب اقبال کراچی۔ قرۃ العین رفیق میرپور خاص۔ محمد اکرم چشتیاں۔ صادق علی فیصل آباد۔

عابد حسین صادق آباد۔ سلمان اوصاف خان پور۔ کاشف محمود راولپنڈی۔ رضوان سرور لاہور۔ الیاس چشتی شیروجدید۔ احمد جلالی، اسلام آباد۔ ارم افتخار راولپنڈی۔ اظہر علی فیصل آباد۔ عظیم رشید آزاد کشمیر۔ سلمان اقبال بہاولپور۔ ممتاز علی کراچی۔ فواد ناصر خان ملتان۔ زبیر ارشد ملتان۔ رضوان احمد لاہور۔ عاصمہ ناصر جہلم۔ سہراب شہید پشاور۔ راشد منہاس ثاقب برجکلاں۔ اطہر محمود منڈی بہاؤالدین۔ اسماء اظہر لاہور سرفراز احمد ملتان۔ ارسلان عارف ملتان۔ آصف عثمان لاہور۔ معین افضل لاہور۔ عائشہ علی راولپنڈی۔ فواد مسعود لاہور۔ جواد نعمان سرگودھا۔ ستار موچی سنجھورو۔ مزمل امین منڈی بہاؤالدین۔ عابد حسین سانگھڑ۔ شاہد راجپوت سانگھڑ۔ زبیر احمد چیمہ ملتان۔ شازیہ بتول جہلم۔ زین العابدین سانگھڑ۔ ذوالفقار احمد سانگھڑ۔ مساعد حمید سرگودھا۔ مسعود احمد اسلام آباد۔ ثمینہ اختر مردان۔ رمضان خان سنجھورو۔ سلیم شیخ سنجھورو۔ احسان الحق ٹیکسلا۔ مسرت جہاں اسلام آباد۔ مسعود حسن خاں اوکاڑہ۔ عائشہ ثناء لاہور۔ ذیشان سلیم لاہور۔

کاشف چوہدری بہاولپور۔ تیمور مرزا واہ کینٹ۔ امیر مجاہدین نیازی باجوڑ ایجنسی۔ بسمہ مسعود لاہور۔ ایم شبیر سنجھورو۔ کامران منصور کراچی۔ نور الہدیٰ سرائے عالمگیر۔ محمد طیب جلالیہ۔ مائدہ مقدس سرائے عالمگیر۔ زہرا مہدی لاہور۔ یونس وحید چشتیاں۔ ساجد محمود اٹک۔ عصمت اللہ مٹھ ٹوانہ۔ حاکم خاں مٹھہ ٹوانہ۔ رفیعہ ریاض فیصل آباد۔ شاہد مجید میرپور۔ عمیر صدیق لاہور۔ ثمر انوار فیصل آباد۔ قیصر اقبال ملتان۔ آصف ایوب جہلم۔ شاہد ندیم چشتیاں۔ شکیل احمد میرپور خاص۔ طلعت شمع سانگھڑ۔ شاہد محمود مٹھہ ٹوانہ۔ سجاد حیدر ٹنڈو ولی محمد۔ عبدالحفیظ مٹھہ ٹوانہ۔ منصور حسن ٹنڈو ولی محمد۔ سلمان شاکر کراچی۔ فہد محمود لودھی لاہور۔ ملک اعجاز ضلع بھکر۔ خاور اقبال ملتان۔ ظفر خورشید بہاولپور۔ عمار ناصر۔ کمالیہ ناصر غازی تحصیل کمالیہ۔ محمد علی منگلا کالونی۔ حمیرا تبسم سیالکوٹ۔ مظفر حیات مٹھہ ٹوانہ۔ فیض سلطان سنجھورو۔ صائمہ اکرم اشرف آباد۔ محمد علی شکیل ٹنڈو آدم۔ عبداللہ خرم سیالکوٹ۔ راحت نوشین لاہور۔ کرن بشیر اسلام آباد۔ سلمان شاہد کراچی۔ توقیر ناصر کمالیہ۔ شیر باز خاں مٹھہ ٹوانہ۔ محمد زبیر ضلع اٹک۔ احتشام الحق حیدر آباد۔ صبیحہ مسعود راولپنڈی۔ اسد بشیر ایبٹ آباد۔ جمشید عالم ٹیکسلا۔ فہیم کوثر مٹھہ ٹوانہ۔ اسماعیل عبدالرحمٰن کراچی۔ آمنہ رحمت اللہ سکھر۔ وجاہت و دود نوشہرہ۔ خولہ کوثر لاہور۔ سلیم انور چشتیاں۔ محمد یٰسین کنگن پور۔ سائرہ مشتاق اسلام آباد۔ حامد رضا چشتیاں۔ ماجد رضا چشتیاں۔ علیم اطہر چشتیاں۔ صائمہ قریشی سانگھڑ۔ بشریٰ جبیں سانگھڑ۔ ارم فاطمہ سکھر۔ سلیم بٹ کھاریاں۔ عظمیٰ حنیف حیدر آباد۔ فائزہ مشتاق اسلام آباد۔ اسماء ناز چشتی کراچی۔ عاطف زاہد ملتان کینٹ۔ کرن آغا حسن ابدال۔ عبدالرؤف روفی ٹنڈو آدم۔

ایک غلطی والے 228 حل موصول ہوئے۔ ان میں سے شروع کے 12 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی 25,25 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

ناصر احمد صادق آباد۔ ماریہ طاہر گوجرانوالہ۔ احسان اللہ کراچی۔ بینا افشین مردان۔ رضوان احمد گدی حیدر آباد۔ عرفان شبیر فیصل آباد۔ سائرہ اسد اسلام آباد۔ منور احمد میاں لاہور۔ رضا امین خاں حیدر آباد۔ حلیمہ عزیز پشاور۔ صائمہ دلدار جھمرہ سٹی۔ ارم طارق سلطنت آف عمان۔

طارق فاروق بھکر۔ زاہد نثار گوٹھ ماچھی۔ قاسم بن نذر کراچی۔ محمد یٰسین گنگ غازی پور۔ شاہد عباس منگووال۔ حماد علی فیصل کراچی۔ عزیز مغل گوجرانوالہ۔ محمد حسنین اسلام آباد۔ فواد جاوید سیالکوٹ۔ محمد جاوید پاشا سیالکوٹ۔ محمد کلیم جوہر آباد۔ شفیق جاوید لاہور۔ اسد قیوم راولپنڈی۔ کامران سعید سکندر آباد۔ زہرا اسحاق خانم کوئٹہ۔ محمد احمد مغل کوئٹہ۔ احسان اختر کراچی۔ صوبیہ ارشاد لاہور۔ محمد فاروق منگلا ڈیم۔ زاہد غفور قریشی لاہور۔ محمد عبداللہ خاں ملتان۔ عدیل یونس لاہور۔ نعمان جنید لاہور۔ قاسم اظہر لاہور۔ ندیم چوہدری لاہور۔ نوید ارشد سیالکوٹ۔ محمد صدیق منگلا ڈیم۔ مہ پارہ فیاض فیصل آباد۔ طلحہ مجید خاں لاہور۔ محسن رضا شرقپور شریف۔ مصباح حفیظ لاہور۔ عدیل طارق ڈی جی خان۔ راحت علی جھال خانو آنہ۔ نبیلہ کرن مرید کے۔ محمد آصف کراچی۔ دانش نزار علی کراچی۔ طارق رفیق اوکاڑا۔ مصباح رسول لاہور۔ عرفان غوری بھکر۔ طارق محمود ملتان۔ محمد بابر گدی حیدر آباد۔ صائمہ عمر گدی حیدر آباد۔ شاہد سلیم واہ کینٹ۔ ہاشم اقبال لاہور۔ محمد فہد کراچی۔ موسیٰ حسن لیہ۔ فیاض عالم تیمر گرہ۔ احمد علی کمال مانسہرہ۔ ناصر جمال مانکی شریف۔ عماد جاوید سیالکوٹ۔ محمد نواز خاں فیصل آباد۔ عمر سلیم واہ کینٹ۔ محمد مدثر حسین اٹک۔ عظیم حیدر ڈی آئی خان۔ شہباز احمد سلیم اسلام آباد۔ عمران فیض رسول لیہ۔ عمران وسیم لاہور۔ غلام اویس فیصل آباد۔ رمضان آجر سمندری۔ احمد بلال مسعود لاہور۔ سمیرا اعوان تحصیل چکوال۔ آمنہ رشید فیصل آباد۔ افراسیاب خاں اسلام آباد۔ راشد نسیم واہ۔ ذیشان مختار لاہور۔ زہرہ حسین گل فیصل آباد۔ نعمان محی الدین چشمہ بیراج۔ اروناہ منان لاہور۔ محمد حسیب پشاور۔ عادل عباسی کراچی۔ وجیہہ ارشاد مظفر آباد۔ سحر ذوالفقار احمد راولپنڈی۔ ماریہ عروج پشاور۔ عمران سلطان حافظ آباد۔ ظفر اقبال کراچی۔ نجم السحر رحیم یار خاں۔ فدا حسین مظفر آباد۔ عمر اعجاز لاہور۔ نور الاسلام نوشہرہ۔ فیصل ہارون ساہیوال۔ حسیب اللہ پشاور۔ ظل ہما پشاور۔ امان اللہ کامرہ اٹک۔ بتول سلیم ملک لالہ موسیٰ محمد علی اسلام آباد۔ سجاد گل لاہور۔ امجد محمود میرپور۔ عرفان احمد لاہور۔ عبدالرحمٰن خان لاہور۔ میمونہ فیاض لاہور۔ شاہد اکرم کوہاٹ۔ ارشد عباس میانوالی۔ عبدالشکور رحیم یار خان۔ شاہنواز احمد راجہ جنگ۔ شرجیل ظفر گوجرانوالہ۔ اکرام الحق پاکپتن۔ یاسر سعادت حیدر آباد۔ عبداللہ بن اسحاق کوہاٹ۔ علی حسن لاہور۔ صومیہ انصاری راولپنڈی۔ تابندہ حق لاہور۔ علی منصور گوجرانوالہ۔ عبدالاحد لاہور۔ شاہد عمران چیچہ وطنی۔ محمد امجد چیچہ وطنی۔ حماد الرحمٰن گوجرانوالہ۔ رضوان مقبول گوجرانوالہ۔ حیدر تنویر لاہور کینٹ۔ فہد رؤف لاہور۔ عمران حفیظ لاہور۔ طاہر ریاض لاہور۔ عاطف الرحمٰن گوجرانوالہ۔ عبدالشکور بھکر۔ بابر کمال راولپنڈی۔ احمد رضا خان لاہور۔ سارہ صبا کراچی۔ اسد جنید میرپور۔ نادیہ حمید اٹک۔ زاہد شمس میرپور خاص۔ حبیبہ مخدوم گوجرانوالہ۔ محمد اویس لاہور۔ جویریہ چوہدری جھنگ۔ ہارون الرشید کراچی۔ خادم حسین کشمور۔ فیصل منیر گوجرانوالہ۔ عامر قریشی میرپور۔ بلال طلال فیصل اٹک۔ خالد سلمان ڈی آئی خان۔ یاسر حسن چھوہر شریف۔ جنید اصغر ڈی آئی خان۔ فرحان عارف بہاولپور۔ صائمہ سید بہاولپور۔ سلمان عارف بہاولپور۔ ایم طارق ملتان۔ ہاجرہ فاروق پشاور۔ علی اعوسجہ زیدی سرگودھا۔ سنبل زاہد فیصل آباد۔ میمونہ یونس کالاں گوجراں۔

دو غلطی والے 212 حل موصول ہوئے ان میں سے 10 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی 20,20 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

افشین زمان پشاور صدر۔ کومل ناصر لاہور۔ محمد علی رضوی حیدر آباد۔ سمیع الدین احمد اسلام آباد۔ سیدہ فرحت بتول ایبٹ آباد۔ امین منظور گجرات۔ ثوبیہ مصطفیٰ لاہور۔ مرزا سکندر بیگ کراچی۔ عالیہ جاوید لاہور۔ حمیرا جبین سعید لاہور۔

تین غلطی والے 110 حل موصول ہوئے۔ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی 10 ساتھیوں کو 15,15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

مدیحہ قیصر لاہور۔ صابر حسین اسلام آباد۔ رابعہ خالد لاہور۔ وسیم خان اسلام آباد۔ فدا حسین وہاڑی۔ قمر النساء آزاد کشمیر۔ محمد رضوان اشرف اسلام آباد۔ آسیہ رفیق لاہور۔ عدیلہ ریاض لاہور۔ رافعہ الیاس اعوان لاہور۔

# آپ کا خط ملا

سرورق بہت پسند آیا۔ چچا بھلکڑ کی کہانی نے رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ میں تعلیم و تربیت 1982 سے پڑھ رہی ہوں۔ اس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک معیاری رسالہ ہے اور نہ صرف تفریح مہیّا کرتا ہے بلکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

(روحینہ عبداللہ، سمن آباد لاہور)

تمام کہانیاں اچھی تھیں مگر سرورق کوئی خاص نہ تھا۔ ذہنی آزمائش کو ختم نہ کیا جائے۔ رسالے میں بیت بازی کا سلسلہ شروع کیا جائے اور اچھے شعر پر انعام دیا جائے۔ (عائشہ گُل، نیس پاک کالونی لاہور)

فروری کا شمارہ پسند آیا۔ خوفناک گوریلے، کتابی کیڑا، زخم کا نشان، سنہری چڑیا اور سبز پانیوں کے شہر کہانیاں اچھی تھیں۔ علی منصور پاشا کی تجویز اچھی ہے۔ یعنی صرف تنقیدی خطوط شائع کریں۔

(اسد بُخاری لاہور)

○ صرف تنقیدی خط ہی شائع کریں اور تعریفی خط ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیں تو ہمارے بہت سے ساتھی اپنا نام چھپوانے کے لیے تعلیم و تربیت میں خواہ مخواہ کیڑے نکالنا شروع کر دیں گے۔

چچا بھلکڑ نے موزے پہنے، جگّو شاہ کا بھوت، زخم کا نشان، کتابی کیڑا کہانیاں بہت پسند آئیں۔ داوٗدی علمی آزمائش کو ختم نہ کیا جائے۔ اِس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ (صبا امین گجرات)

سرورق اچھا لگا۔ کہانیاں بھی مزیدار تھیں، خاص کر چچا بھلکڑ، زخم کا نشان اور کتابی کیڑا تو بہت ہی پسند آئیں۔ عظیم مسلمان کا سلسلہ ختم کر کے "آیئے دوست بنائیں" کے دو صفحات کر دیے جائیں۔

(رانا طاہر محمود، منظور کالونی کراچی)

تعلیم و تربیت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اِس کے ناول، کہانیاں، نظمیں، مضمون سب ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ آپ کا خط ملا میں مُحسنہ خلیل میرپور آزاد کشمیر نے لکھا ہے کہ ہونہار مصوّر کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے۔ آپ اِن صاحبہ کی یہ بات ہرگز نہ مانیے کیونکہ اس سلسلے کو بند کر دینے سے رسالہ بے رونق ہو جائے گا۔

(فرحانہ خلیل، ماڈل کالونی کراچی)

سرورق پسند نہ آیا۔ کہانیاں نہایت دلچسپ تھیں۔ خاص کر ذکیہ بلگرامی کی "چچا بھلکڑ نے موزے پہنے۔"

(عطیہ ارشد، اسلام پورہ سیالکوٹ)

کہانیوں میں چچا بھلکڑ نے موزے پہنے، خوفناک گوریلے، جگّو شاہ کا بھوت اور فضل حلوائی اچھی تھیں۔ نیا سیریل سبز پانیوں کے شہر بہت اچھا جا رہا ہے۔ (عاطف اِمتیاز حنفی، اسلام آباد)

سرورق بہت عمدہ تھا۔ سلسلہ وار ناول "سبز پانیوں کے شہر" کی دوسری قسط بہت اچھی لگی۔ کہانیوں میں خوفناک گوریلے اور "آپ بھی لکھیے" کی پہلی کہانی "ایڈمرل" بہت اچھی تھیں۔

(یاسر سعادت، لطیف آباد حیدر آباد)

چچا بھلکڑ سے مِل کر بہت ہی مزا آیا۔ نظمیں بھی پسند آئیں۔ اِس دفعہ رسالے میں فُرصت کے کھیل بھی تھے۔

(روبینہ جاوید، صدر بازار راولپنڈی)

بینش اعجاز سیالکوٹ کا مشورہ بہت پسند آیا۔ آپ "عنوان بتایئے" دوبارہ شروع کر دیں اور ہونہار مصوّر ختم نہ کریں۔ اِسے جاری رکھیں۔ (مُنزّہ نیازی، جوہر ٹاؤن لاہور)

سرورق شاندار تھا۔ کہانیاں پڑھ کر تو بس مزہ ہی آگیا۔ "کیا، کیوں، کیسے؟" پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ "سبز پانیوں کے شہر" پڑھ کر تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں بھی اُن کے ساتھ سیر کو نکلا ہوا ہوں۔ لطائف بھی مزیدار تھے۔ (شبیر علی چنگیزی، اسلام پورہ لاہور)

تعلیم و تربیت بہت ہی پیارا رسالہ ہے، لیکن عرصے سے اِس میں کچھ بور سلسلے چلے آ رہے ہیں، خاص طور پر "عظیم مسلمان" اور "سُنہری چڑیا۔" "ہونہار مصوّر" کا بھی وہ مزہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اِنہیں بند کر دیں۔ (محمّد جُنید اصغر، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان)

سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانیاں اور نظمیں بھی اچھی تھیں۔ آیئے دوست بنائیں کا سلسلہ ختم کر دیں۔ یہ کافی بور کرتا ہے۔

(محمّد حسن، سعیدہ احمد، صدیقہ احمد اعوان)

کہانی نمبر بہت پسند آیا تھا اور اب فروری کا رسالہ بھی پسند آیا۔ اس کی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ (محمد ذیشان خان، ڈیرہ اسماعیل خان)

سُنیے سب کی، لیکن کیجیے وہی جسے آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ اِس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جسے ہم (جنہیں آپ بچّے کہتے ہیں) پسند کرتے ہیں۔

(کاشف اعجاز، نارتھ ناظم آباد کراچی)

تعلیم و تربیت پہلی ہی تاریخ کو مل گیا اور ایک ہی دن میں سارا پڑھ

لیا۔ کہانیوں میں چچا بھلکڑ، خوفناک گوریلے، جگّو نشاہ کا بھوت اور سبز پانیوں کے شہر پسند آئیں۔ نظم تتلی بھی اچھّی لگی۔ (حمّادُالحسن، کراچی)

سرورق بالکل اچھّا نہ تھا۔ البتّہ کہانیاں سب ہی سبق آموز اور اچھی تھیں۔ (روزینہ خان ڈگری سندھ)

چچا بھلکڑ کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ البتّہ سرورق کچھ اچھّا نہیں لگا۔ (عائشہ عُمر، یونیورسٹی ٹاؤن پشاور)

اِس ماہ کا تعلیم و تربیت بہُت عُمدہ تھا۔ ہم سب کو بہت پسند آیا۔ (حافِظ محمّد ناصِر محمود مظہری، منگلا کالونی)

سرورَق خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں خوفناک گوریلے، اور جگّو شاہ کا بھوت پسند آئیں۔ (راشِد اشرف اعوان، واپڈا کالونی حیدر آباد)

ممتازُ الحق صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے مجھے اُس سے اِختلاف ہے۔ داوٗدی عِلمی آزمائش سے معلومات میں اِضافہ ہوتا ہے۔ اِسے جاری رکھا جائے۔ (سعید مُغل، فیصل آباد)

فروری کا تعلیم و تربیت بھی حسبِ توقّع بہُت شاندار تھا۔

(نادیہ رائے فیصل آباد)

چچا بھلکڑ نے موزے پہنے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ باقی کہانیاں بھی اچّھی تھیں۔ (قاسم علی، گاؤں ڈھاکہ ضلع راولپنڈی)

فروری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ چچا بھلکڑ کو پاکر بہت خوشی ہوئی۔ (محمّد شاہد احسن، پیراں غائب ملتان)

فروری کے شمارے میں کراچی کے ممتاز الحق انصاری کی تجویز قبول نہ کیجیے۔ عِلمی آزمائش کو جاری رکھیے۔ (طارق فاروق، جنڈانوالہ)

ماہ فروری کا سرورق بہت خوبصورت تھا۔ تمام کہانیاں بہت دلچسپ تھیں۔ (ایم عطاءُ اللہ چوک دلالانوالہ جتوئی، ضلع مظفر گڑھ)

ذکیہ بلگرامی صاحِبہ کے ہر دِلعزیز کردار چچا بھلکڑ نے بہت ہنسایا۔ تِتلی، چمن کی بہار اور میٹھے بول نظمیں بھی پسند آئیں۔

(نبیلہ کرن، لاری اڈّہ مُرید کے)

فروری کا شمارہ بہت پسند آیا مگر سرورق بالکل اچھّا نہ لگا۔

(بلقیس بانو لاہور)

اِس دفعہ جن کہانیوں نے زیادہ مُتأثّر کیا وہ یہ تھیں، خوفناک گوریلے، زخم کا نشان اور بد نصیب جُبلہ کی کہانی۔ (عامر محمود طاہر، سکھ پور)

اِن ساتھیوں کے خطوط جگہ کی کمی کے باعث شائع نہ ہو سکے۔

عِمران اللہ خان بنگلہ نواب صاحب۔ حُمیرا نازش راولپنڈی۔ صفی اللہ خلیل لاہور۔ سونیا محبوب۔ کیاوش رحمان پشاور۔ محمد اشرف لیّہ۔ علی حسنین چیچہ وطنی۔ مہ وش شاہد ایبٹ آباد۔ علی اصغر جدران فیصل آباد۔ تنزیلہ یاسر بہاولپور۔ تسمیہ ریاض لاہور۔ سارہ سعید ملک بہاولپور۔ سیّدہ صائمہ دلدار جھمرہ۔ زوبیا احمد سرگودھا۔ مصطفیٰ شہزاد راجہ جنگ۔ رضوانہ صنوبر جھنگ صدر۔ ہما قاضی، بصیر قاضی پشاور۔ دیبا ناز پشاور۔ امین اسماعیل کراچی۔ جلیل الرحمٰن پشاور۔ اشفاق حسین جھنڈیر بستی ملوک۔ شاہد خلیل گڑھ مہاراجا۔ محمود عاصم پشاور۔ جویریہ صمدانی پشاور۔ عمر فاروق گکھو منڈی۔ غلام جان شنکیاری۔ فلیحہ مریم پشاور۔ صائمہ محمود کراچی۔ زاہد اقبال کھوکھر گوجرانوالہ۔ سیّدہ بتول راولپنڈی۔ جناب امین لاہور۔ سائرہ مدثّر لاہور۔ حفصہ فاروقی جھنگ۔ اکبر علی ساجد شیخوپورہ۔ محمد ہاشم میلسی۔ امجد الرحمٰن فیصل آباد۔ محمد عمران فیصل آباد۔ سمیرا اعوان چکوال۔ محمد انیس شیخوپورہ۔ روبینہ ملک کھاریاں۔ نثار احمد جیکب آباد۔ فرحت بتول ایبٹ آباد۔ رابعہ اکرام لاہور۔ اِقراء ضمیر مچھ بولان۔ حماد ظہور حسین کوہلو۔ ثناء اللہ عبداللہ کراچی۔ عفت جہاں بنّوں۔ عمار متی الحسنین اسلام آباد۔ طارق رفیق اوکاڑا۔ سمیرا خورشید گوجرانوالہ۔ رخسانہ نسیم پشاور۔ مہ جبین پشاور۔ شیراز خان صوابی۔ اقتدار، عمران لیّہ۔ اِمتیاز حسین بھالیہ۔ میمونہ خالد واہ کینٹ۔ ملک شفیق احمد لاہور۔ سیف الرحمٰن گوجرانوالہ۔ حفصہ عارف اسلام آباد۔ عبدالغفار ڈھلوں گڑھ فتح شاہ۔ منزّہ نورین راولپنڈی۔ ثمینہ مختار پشاور۔ آصف جاوید کراچی۔ غلام شعیب فیصل آباد۔ نوشین نزار علی کراچی۔ عمران سہیل بوبی اوکاڑہ۔ وقار احمد اعوان شیخوپورہ۔ الماس قاسم آزاد کشمیر۔ حلیمہ اختر فیصل آباد۔ کامران اقبال چکوال۔ اِفتخارُ الرحیم لاہور۔ شازیہ نذیر بہاولپور۔ عظمیٰ سلیم لاہور۔ رحیم انجم ٹل کوہاٹ۔ نبیلہ ثقلین خانیوال۔ جویریہ چوہدری جھنگ۔ سفیرالدین جہلم۔ شہزاد بٹ کھاریاں۔ مدثر ملک لاہور۔ محمد یٰسین غازی پور۔ گل فرحانہ ملتان۔ ایم اسلم خاں مظفر گڑھ۔ شاد علی درگا پور۔ شہزاد احمد اسلام آباد۔ طارق یونس ساہیوال۔ سرفراز احمد اسلام آباد۔ عبداللہ فرحیل ہری پور۔ منیب ہادی پشاور۔ احمد زیدی اسلام آباد۔ لینا اقبال کوہاٹ۔ ارشد حبیب ملتان۔ اویس حبیب پنوں عاقل۔ محمد طیّب لاہور۔ رابعہ قریشی لاہور۔ عمر بشیر تبسّم میرپور۔ فرح عندلیب موہری شریف۔ ذوالفقار احمد سرائے عالمگیر۔ رمضان بشیر اوکاڑہ۔ خاور اقبال پشاور۔ محسن محمود منگلا۔ محمد شہزاد باغ۔ حسین علی گاؤں اصغر اٹک۔ سہیل بخاری ڈی جی خان۔ فیصل یونس لاہور کینٹ۔ ادریس احمد کھاریاں۔ کنور عمران ہارون آباد۔ ریاض احمد باٹیانوالہ۔ غلام مصطفیٰ عارف والا۔ رابعہ حشمت پشاور۔ وقار احمد سنجھورو۔ تقدیس کاظمی گوجرانوالہ۔ الطاف حسین جھنڈ یر بستی لوک۔ شاہد ندیم چشتیاں۔ فضل بادشاہ پشتون گڑھی۔ نوید اسلم ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ فدا حسین ہری پور ہزارہ۔ عمر فاروق راولپنڈی۔ قدوہ خلیل میر پور۔ بیبن الیاس وزیر آباد۔ مسعود احمد اسلام آباد۔ معراج دین لاہور۔ عمر زبیر لاہور۔ عمران مغل کھاریاں۔ عروج واہ کینٹ۔ عامر اقبال ملتان۔ آصف معراج لاہور۔ انور کمال بنوں۔ سہیل اصغر موہری شریف۔ کریم نواز احمد پور شرقیہ۔ کاشفہ خاتون

ایک شخص موچی کے پاس گیا اور اُسے جُوتا ٹھیک کرنے کو کہا۔ موچی نے جُوتے کو پانی کے ٹب میں بار بار ڈبونا شروع کیا تو جُوتے کے مالک نے کہا "میں نے جوتا مرمّت کرنے کو دیا ہے، تیراکی سکھانے کے لیے نہیں۔" (محمد اشفاق)

ایک دِن مُلاّ نصرُالدّین چند ساتھیوں کے ساتھ جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک گائے کی آواز آئی۔ مُلاّ کے دوستوں نے کہا "ملاّ صاحِب، آپ کو گائے بُلا رہی ہے۔" ملاّ صاحِب گائے کے پاس چلے گئے۔ واپس آئے تو ساتھیوں نے پوچھا "گائے کیا کہہ رہی تھی؟" ملاّ نے کہا "گائے کہہ رہی تھی کہ آپ اِن گدھوں کے ساتھ کیوں پھر رہے ہیں؟"

(صائمہ فاروق، انعم فاروق شیراں والا دروازہ لاہور)

ٹی وی ڈرامے کے مُصنّف نے اپنے پڑوسی سے پوچھا "آپ نے ٹی وی پر میرا لکھا ہوا ڈراما دیکھا جس میں میاں بیوی ہر وقت لڑتے رہتے ہیں؟"

پڑوسی بولا "نہیں، جناب۔ لیکن اُس کی ریہرسل اکثر آپ کے گھر میں ہوتی دیکھی ہے"

(طُوبیٰ سعدیہ، ماڈل ٹاؤن لاہور)

شوہر کو کار چلاتے ہوئے گرمی اور گھُٹن محسوس ہوئی تو اُس نے بیوی سے کہا "شیشہ کھول دو۔ گرمی کے مارے بُرا حال ہو گیا ہے۔"

بیوی بولی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ پیچھے ہمارے پڑوسیوں کی کار آ رہی ہے۔ اِس طرح اُنھیں پتا چل جائے گا کہ ہماری کار میں ایئر کنڈیشنر نہیں ہے۔"

(عُمیر ایّوب، شاہدرہ لاہور)

ایک رات مُلاّ نصرُالدّین اپنے مکان میں سو رہے تھے کہ ایک چور مکان میں گھُس آیا اور ملاّ کا سارا سامان اِکٹھا کر کے چلتا بنا۔ اچانک ملاّ کی آنکھ کھُل گئی۔ اُنھوں نے چارپائی سر پر رکھی اور چور کے پیچھے پیچھے اُس کے گھر پہنچ گئے۔ پہلے تو چور گھبرایا پھر غصّے سے بولا "آپ یہاں کیوں آئے ہیں"؟ ملاّ بولے "میں کافی دنوں سے اپنا مکان تبدیل کرنا چاہتا تھا، لیکن سامان اُٹھانے کے لیے کوئی مزدور نہیں مِل رہا تھا۔ سامان یہاں رکھ دو اور بتاؤ تمھیں کتنے پیسے دُوں؟"

(یاسر اقبال، سمن آباد لاہور)

ایک شخص اپنے دوست سے تعزیت کرتے ہوئے کہنے لگا "تمھارے دادا جان کے اِنتقال کی خبر سُن کر بہت افسوس ہوا۔ کیا عُمر تھی مرحوم کی؟"

"اٹھانوے سال" جواب ملا۔

"اوہ! کتنے افسوس کی بات ہے! دو سال اور جی لیتے تو سنچری ہو جاتی۔" (کاشفہ خاتون نقوی، نارتھ کراچی)

"بیٹے، ایک اور آئس کریم کھاؤ گے؟" کنجوس باپ نے بیٹے سے پوچھا۔

"لیکن ابُّو، میں نے تو ایک آئس کریم بھی نہیں کھائی" بیٹا حیرانی سے بولا۔

"تم بھول رہے ہو، بیٹے۔ پچھلے سال جب ہم یہاں آئے تھے تو تم نے ایک آئس کریم نہیں کھائی تھی؟"

(سیّد مکرّم حُسین عابدی، راولپنڈی)

ایک صاحِب نے اپنے دفتر کے بڑے افسر کی دعوت کی۔ افسر کی ناک بہت لمبی تھی۔ اُن صاحِب نے اپنے بچّے سے کہا کہ بیٹے، اُن کی ناک دیکھ کر ہنسنا مت، اور نہ ناک کے بارے میں کوئی بات کرنا۔"

شام کو وہ افسر اُن صاحِب کے گھر آئے تو بچّے نے اُنھیں ادب سے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ بچّے کی ماں نے بڑے اِطمینان سے کپ میں چائے ڈالی اور پھر افسر سے پوچھا "آپ کی ناک میں کتنی چینی ڈالُوں؟" (عالیہ قیوّم بٹ، گکھڑ منڈی)

# آیئے دوست بنائیں

نعمان خالد 15 سال
کرکٹ، ٹکٹ جمع کرنا
مکان نمبر 5 بلاک T
نزد گلشن مارکیٹ نیو ملتان - ملتان

محمد حسین قریشی 15 سال
کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، مطالعہ
V.P حبیب بنک مال روڈ
پشاور صدر

اظہر مقصود ڈار 14 سال
کرکٹ
اظہر مقصود سائیکل شاپ
ایم بلاک - کھاریاں

حبیب الرحمن 15 سال
ٹکٹ جمع کرنا، سکے جمع کرنا، فٹ بال
مکان نمبر 119 محلہ طارق آباد
گلی مناراں والی - ملتان

عمران بھٹی مانی 11 سال
قلمی دوستی - سکوائش کھیلنا
میجر جاوید یوسف - T.61 فیز II
ایل سی سی ایچ ایس - لاہور چھاؤنی

سید عامر علی شاہ 13 سال
کراٹے - تعلیم و تربیت کا مطالعہ
گل بہار نمبر 1 -
گلی نمبر 3 - پشاور

خرم رشید خان 15 سال
وسیم اکرم کی تصاویر جمع کرنا
مکان نمبر 1 - گلی نمبر 12
بلاک S - نیو ملتان

عامر اللہ قریشی 11 سال
کرکٹ، تعلیم و تربیت پڑھنا
مکان نمبر 4 - گلی نمبر 12 -
نوجہ قدیم - پشاور صدر

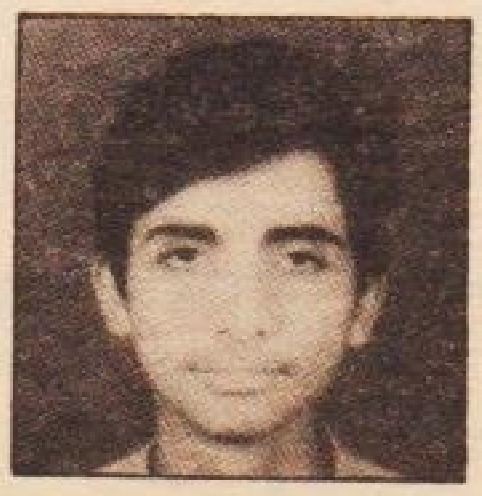

عمران جاوید 16 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا، پتنگ بازی
محمد حنیف قصاب، گلی پرانا ڈاک
خانہ تحصیل کاموکی ضلع گوجرانوالہ

محمد عامر عباس [illegible] سال
ہاکی کھیلنا
118A [illegible]
[illegible] - کراچی

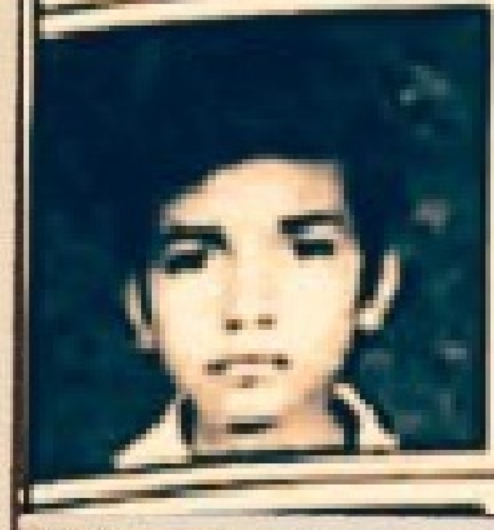

[illegible] 14 سال
مطالعہ، تعلیم و تربیت پڑھنا
15-A-2 R-516
[illegible] - کراچی

محمد عرفان بشارت 12
ٹکٹ جمع کرنا
نول ہاؤس - ریاض چوک
نیا شہر - جھنگ صدر

فہیم اقبال قریشی 12
تعلیم و تربیت پڑھنا
محمد لیسین - ریل بازار عبدالحکیم
ضلع خانیوال

عمر حیات خاں 13 سال
فٹ بال، ٹکٹ اور سکے جمع کرنا
A-21 مُکلسہ روڈ - لالہ زار
راولپنڈی

محمد عامر اسماعیل 12 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا، کرکٹ کھیلنا
C/O کولمبو پلاسٹک -
میٹھادر چوک کراچی 74000

محمد عبدہ 16 سال
قلمی دوستی، کرکٹ، ٹکٹ جمع کرنا
مکان نمبر W/36
گلستان کالونی فیصل آباد

محمد قاسم خاں 16 سال
کرکٹ، ہاکی
کچا قلعہ - شاہ فیصل کالونی
حیدر آباد

شمیل حیدر 12 سال
فٹ بال کھیلنا
G-10-2,8/1-E
اسلام آباد

محمد شفقت رسول 14 سال
ٹکٹ جمع کرنا، مطالعہ
مکان نمبر 41 - بلاک Y
فرید ٹاؤن - ساہیوال

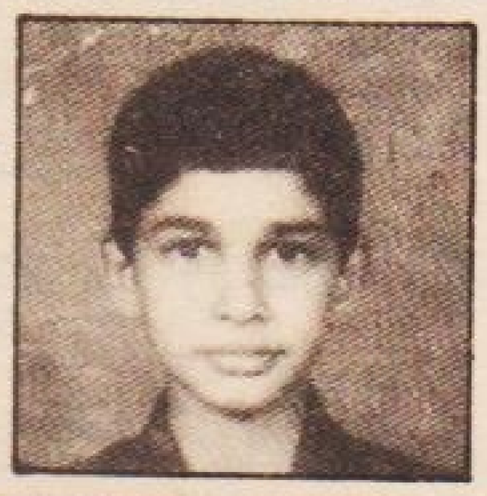

محمد عاطف 12 سال
سائنس، کرکٹ
6 - خیبر پارک نمبر 1
سنت نگر - لاہور

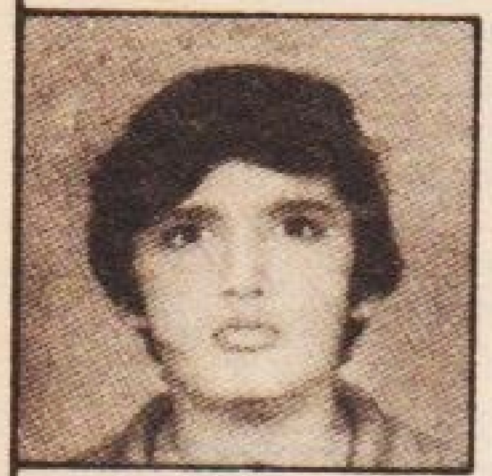

عمر جاوید 11 سال
قلمی دوستی - سکوائش کھیلنا
میجر جاوید یوسف T-61 فیز II
ایل سی سی ایچ ایس لاہور چھاؤنی

اکرم سیال توقیر 16 سال
ریڈیو سننا اور لکھنا
وکیل والا - چک نمبر 574
P/O آدم پور ننکانہ صاحب

رضوان حیدر 15 سال
قلمی دوستی، کرکٹ
معرفت محمد طفیل ظفر - گلی نمبر 1
مکان نمبر 102 - میاں چنوں

## آیئے دوست بنائیں

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے

یہ کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں۔)

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- شارع بن بادیس لاہور۔

مارچ: 1993ء

نام ______ عمر ______

مشاغل ______

پتا ______

# آپ بھی لکھیے

## پیغام

جاوید اقبال کہنوروی، حیدر آباد

جب ہم آٹھویں جماعت میں پہنچے تو ہمیں ایسے اُستادوں سے واسطہ پڑا جو بہُت ہنس مُکھ اور ملنسار تھے۔ لیکن ایک ٹیچر ایسے بھی تھے جو کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ جب وہ کلاس میں آتے تو پہلے پڑھاتے اور اِس کے بعد کاپیاں چیک کرتے۔ اگر کسی کا کام مکمّل نہ ہوتا تو سخت سزا دیتے۔

ہم نے سوچا کہ یہ نئے نئے آئے ہیں۔ اِنھیں تحفہ وغیرہ دیں گے تو تعلّقات اچھّے ہو جائیں گے۔ ایک دن صبح ہی صبح ہم نے گلاب کا پھول توڑا اور اِسکول پہنچ کر سر کا اِنتظار کرنے لگے۔ سر آئے تو ہم نے اُنھیں گلاب کا پھول پیش کیا اور کہا کہ یہ آپ کے کوٹ میں اچھّا لگے گا۔ سر بولے "شکریہ۔ میں گلاب پسند نہیں کرتا۔" یہ کہ کر وہ آگے چل دیے اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔

پھر ایک دن ہم نے اُنھیں ایک رسالہ پیش کیا۔ سر نے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولے "میں یہ رسالہ ہر ماہ خریدتا ہوں، اور یہ میرے پاس ہے۔" اِس دفعہ پھر ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہماری یہ حرکتیں ہمارا ایک دوست بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا کہ سر کو کوئی بڑھیا سا تحفہ دو۔ شاید وہ قبول کر لیں۔ اُس کے مشورے سے ہم نے ایک بڑھیا سی پرفیوم خریدی اور خوب صورت سی پیکنگ میں سر کی خدمت میں پیش کر دی۔

سر پرفیوم دیکھ کر بولے "میں تمہاری پسند کی داد دیتا ہوں، لیکن میرے پاس اِس سے بھی اچھی پرفیوم ہے۔" ہمیں بہُت غصّہ آیا اور ہم منہ پھُلائے کلاس میں چلے گئے۔

دوسرے روز جب ہم اِسکول پہنچے تو سر نے ہمیں بُلایا۔ ہم ڈرتے ڈرتے اُن کے کمرے میں پہنچے۔ انھوں نے بڑے پیار سے بٹھایا اور بولے "آپ سوچتے ہوں گے کہ میں آپ کے تحفے کیوں نہیں لیتا۔ تو بیٹے، میں اُن ضمیر فروش اُستادوں میں سے نہیں ہوں جو تحفے لے کر آپ لوگوں کو اِمتحان میں اچھّے نمبروں سے پاس کر دیتے ہیں اور اگر آپ کوئی غلطی کرتے ہیں تو مُعاف کر دیتے ہیں۔ بیٹے، اِس طرح دوسرے طالبِ علموں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اگر تم میری نظر میں اچھّے بننا چاہتے ہو، اور چاہتے ہو کہ اچھّے نمبر حاصل کرو تو خوب محنت کرو، دل لگا کر پڑھو، آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔ پھر تم دیکھنا کہ تمھیں کیسے کام یابی نصیب ہوتی ہے۔ تم میرا یہ پیغام دوسروں تک بھی پہنچا دینا کہ میرے دل میں صرف اُس طالبِ علم کی عزّت ہے جو اُستادوں کو تحفوں کا لالچ دے کر اِمتحان پاس نہ کرے بلکہ اپنی قابلیّت اور محنت سے آگے بڑھے۔ جاؤ، شاباش! محنت کرو اور پڑھائی پر توجّہ دو، تحفوں پر نہیں۔"

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)

## ہم بنے اُستاد

فرحت سلیم

اُن دنوں ہمیں میٹرک کے اِمتحان کے بعد فراغت تھی، لیکن بوریت بھی بہُت زیادہ تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے کہ بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پڑھنے کا موڈ نہیں تھا اور بور بھی نہیں ہونا چاہتے تھے، فارغ رہ کر۔ اچانک ایک ترکیب جھماکے سے ہماری کھوپڑی میں آئی، کیوں نہ ٹیچنگ کی جائے یعنی کسی اِسکول میں پڑھایا جائے؟

اب مسئلہ یہ تھا کہ ابّو کو راضی کیسے کیا جائے، کیوں کہ اُن کے ماننے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بہر حال، ہم نے اُن سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم ان کے رُوبرُو حاضر تھے۔ ابّو نے جب ہماری بات سُنی تو بولے "بیٹا جانی، جتنی تمھیں تنخواہ ملے گی اُس سے زیادہ تو ہم تمھیں پاکٹ منی دیتے ہیں۔"

"نہیں ابُّو، پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم تو صرف اپنا شوق پورا کرنا چاہتے ہیں" ہم نے بڑے لاڈ سے کہا اور آخر کار ہم اپنی بات منوانے میں کام یاب ہو ہی گئے۔

ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک پرائیویٹ اِسکول

ہے۔ ہم نے وہاں ٹرائی کی تو ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ ہمارا ہی اِنتظار کر رہے تھے۔ پانچویں جماعت کی مِس نے اِسکول چھوڑ دیا تھا، اِس لیے ہمیں پانچویں جماعت دی گئی۔

ہماری ٹیچنگ کا یہ پہلا دن تھا لہٰذا ہم بڑے زور و شور سے تیّاری کر کے اِسکول گئے۔ جماعت میں پہنچے تو سب بچّے ہمارے اِستقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اپنی اِس عزّت افزائی پر ہمارا سیروں خون بڑھ گیا۔ سب سے پہلے ہم نے اپنا تعارُف کروایا اور اِس کے بعد بچّوں سے اُن کے نام پُوچھے۔

ایک بچّے سے ہم نے پُوچھا "طارِق، تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"جی، ڈاکٹر ہیں" اُس نے جواب دیا۔

دوسرے سے پوچھا تو اُس نے کہا "میرے والِد اِنجینئر ہیں۔"

ایک اور بچّے سے پوچھا کہ تمہارے والِد کیا کرتے ہیں تو اُس نے معصومیّت سے جواب دیا "میری امّی جو کہتی ہیں، میرے ابّو وہی کرتے ہیں۔" اس بے تُکے جواب پر ہم نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔

چُوں کہ کلاس میں ہمارا پہلا دن تھا، لہٰذا ہم نے لیکچر دینا ضروری سمجھا۔ کچھ باتوں کے بعد ہم نے کہا "بچّو، خوب محنت کیا کرو۔ دل لگا کر پڑھا کرو۔"

ایک بچّے نے کھڑے ہو کر کہا "مِس، میں تو عینک لگا کر پڑھتا ہوں۔" اِس پر سارے بچّے ہنس پڑے۔

ہم نے اُسے بیٹھنے کا اِشارہ کیا اور کہا "بچّو، محنت ہی سے کام یابی نصیب ہوتی ہے۔ جو سُست اور کاہِل ہوتے ہیں، وہ بڑے نہیں بن سکتے۔"

اِس لیکچر کے بعد ہم نے بچّوں کو بستے کھولنے کے لیے کہا اور ہم نے بھی ایک کتاب کھولی "اچھا، بھئی، تم بتاؤ اکبر کہ سب سے بڑا سمُندر کون سا ہے؟"

ہم نے کتاب میں سے سوال دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ہم نے باری باری سب بچّوں سے پوچھا لیکن کسی کو اِس کا جواب نہ آتا تھا۔ "کافی نالائِق بچّوں سے واسطہ پڑا ہے" ہم نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اچھا، بھئی، ہم بتاتے ہیں۔ سب سے بڑے سمُندر کا نام ہے۔ بحرالکاہِل" ہم نے بچّوں کو بتایا۔

اکبر کھڑا ہو کر بولا "مِس، ابھی آپ نے کہا تھا کہ جو کاہِل ہوتے ہیں، وہ بڑے نہیں بن سکتے۔ تو پھر بحرالکاہِل کیسے بڑا بن گیا؟ یہ بھی تو کاہِل ہے۔"

اِس سوال کے جواب کا ہمیں پتا نہیں تھا لہٰذا چُپ ہو گئے۔ اب ہم نے سائنس کی کتاب کھولی۔ اُس میں ایک سوال تھا کہ ہوائیں کیسے چلتی ہیں؟ ہم نے احمد سے پوچھا تو اُس نے نہایت معصومیّت سے جواب دیا، اللہ کے حکم سے چلتی ہیں۔

اِس کے بعد ہم نے اِنگلش کی کتاب کھولی اور نوید سے پوچھا "اِس کی انگلش بتاؤ، وہ اِتنا کھیلا کہ کھیلتا ہی چلا گیا۔"

"ہی اِتنا پلیڈ کہ پلیڈ ہی پلیڈ" نوید نے جواب دیا، اور اُس کے اِس جواب نے ہمارا سر گھُما دیا۔ اُف اللہ! کتنی نالائق جماعت سے پالا پڑا ہے! تھوڑی ہی دیر میں ہمارا سر دُکھنے لگا۔ ایک بچّے سے ہم نے پوچھا کہ بتاؤ، سب سے زیادہ گرمی کہاں پڑتی ہے تو اُس نے جلدی سے جواب دیا "مِس، ہمارے باورچی خانے میں۔" اُس کے جواب پر تو ہمارا پارہ ہائی ہو گیا اور ہم اُس گھڑی کو کوسنے لگے جب ٹیچنگ کا شوق ہمارے سر میں سمایا تھا۔ ہم واقعی اِتنے نالائق بچّوں کو پڑھانے کے اہل نہیں تھے۔ ایک ہی دن میں ہمیں چھٹی کا دُودھ یاد آ گیا تھا۔

ایک بچّے نے ہم سے پُوچھا "مِس، یہ بتائیں کہ پہلے مُرغی پیدا ہوئی تھی یا انڈا؟"

ہم نے اپنے سر کو ہولے ہولے دباتے ہوئے جواب دیا "انڈا۔"

"مِس، انڈا کہاں سے آیا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

ہم نے جواب دیا "مُرغی سے۔"

"مُرغی کہاں سے آئی تھی؟" اُس نے پوچھا اور ان سوالوں کی بھُول بھُلیّوں میں گُم ہو کر ہم بھی بھول گئے کہ پہلے انڈا پیدا ہوا تھا یا مرغی۔

خدا خدا کر کے ہمارا پہلا دِن ختم ہوا۔ مگر وہ دن ہم نے جیسے گزارا تھا، صرف ہم ہی کو پتا ہے۔ گھر واپس آ کر ہم نے ابّو کو یہ رُوداد سُنائی تو اُنھوں نے کہا "بچّوں کو پڑھانے کے لیے بڑے صبر اور برداشت کی ضرورت ہے۔ پہلے تُم اپنے

آپ میں یہ خوبیاں پیدا کرو، اِس کے بعد بچّوں کو پڑھانا۔ "—————— (دوسرا انعام: 45 رُوپے کی کتابیں)

○ فرحت سلیم اپنا پورا پتا لکھیں تاکہ انہیں انعام بھیجا جاسکے۔

## سائیکل کی تلاش

نُعمان احمد خاں، کراچی

جیسے ہی میں صحن میں داخل ہُوا، مجھے حیرت کا ایک شدید دھچکا لگا۔ میری حیرت بجا تھی، کیوں کہ صحن میں مجھے اپنی چہیتی سائیکل کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سائیکل آخر کہاں جا سکتی ہے؟ مگر ٹھہریے۔ میں شروع سے آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔

یہ اب سے تقریباً 20 منٹ پہلے کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنا پسندیدہ رسالہ "تعلیم و تربیت" پڑھ رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو حسن کی شکل نظر آئی۔ اُسے دیکھ کر میں نے دِل میں سوچا کہ یہ اب مُجھ سے کہے گا کہ یار، فزکس کے نوٹس تو دے دو، یا کیمسٹری یا اُردو کی کتاب وغیرہ وغیرہ۔ وہ مجھے اُس وقت کباب میں ہڈّی محسوس ہُوا۔

خیر، میں نے اُس سے آنے کی وجہ پُوچھی تو کہنے لگا کہ آج موسم بہُت خوش گوار ہے۔ صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کیوں نہ سائیکل پر سیر کرنے چلیں؟ اُس کی یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے کہا، چند مِنٹ ٹھہرو۔ میں تیّار ہو کر آتا ہوں۔

اور اب یہ حال تھا کہ میں تیّار ہو کر صحن میں ہکّا بکّا کھڑا تھا اور سائیکل غائب تھی۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ گھر میں سائیکل چلانے والا کوئی اور نہ تھا۔ میری صرف ایک بڑی بہن ہیں جو اُس وقت کچن میں تھیں۔ اُن سے پوچھا تو اُنہوں نے لاعلمی کا اِظہار کیا۔ امّی کل شام سے نانی کے گھر گئی ہوئی تھیں اور اُن کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ابھی تک وہیں تھیں۔ ابّو آفس جا چکے تھے۔

پُورے گھر کا پوسٹ مارٹم کرنے پر بھی جب سائیکل نہ ملی تو میں پریشان ہو گیا۔ عین اُسی وقت حسن نے باہر سے چیخ کر کہا "تیّار ہو رہے ہو یا سولہ سنگھار کر رہے ہو؟ باہر آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔" میں جلدی سے باہر آیا اور اُس سے کہا کہ میری سائیکل کھو گئی ہے۔ کل شام صحن میں کھڑی کی تھی۔ خدا جانے کہاں گئی۔ وہ بولا "ارے بے وقوف! گھر میں ہی ہو گی اور کہاں جائے گی بھلا۔"

"مگر میں نے تو سارے گھر کو چھان مارا ہے" میں بے چارگی سے بولا۔

"تمہاری آنکھوں کا کیا بھروسا۔ کہیں تم نے سائیکل کو واشنگ مشین سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا ہو" اُس نے میری کم زور آنکھوں پر چوٹ کی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ نانی کے گھر جا کر امّی سے پُوچھ لیا جائے۔ ہو سکتا ہے اُنہوں نے کل شام کسی کو دے دی ہو اور وہ واپس کرنا بھول گیا ہو۔ اگرچہ مجھے اِس بات کا یقین نہ تھا مگر پھر بھی میں حسن کو لے کر نانی کے گھر کی طرف چل دیا جو اگلے محلّے میں تھا۔ ہم اُس محلّے کے گراونڈ کے قریب پہنچے تو ایک لڑکا سائیکل پر سوار آتا نظر آیا۔ اُسے دیکھ کر میں زور سے اُچھلا، کیوں کہ وہ میری ہی سائیکل تھی۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ ایک تو چوری اُوپر سے سینہ زوری۔ میرے ہی سامنے وہ میری سائیکل کی مٹّی پلید کر رہا تھا۔ ٹھہر جا! ابھی خبر لیتا ہُوں! یہ سوچ کر میں آگے بڑھا اور سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا۔ وہ لڑکا بولا "کیا بات ہے، بھائی؟"

"شکل سے تو شریف لگ رہے ہو اور حرکتیں ایسی اوچھی"؟ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ چوری کر کے معصوم سی شکل بنا لیتے ہیں تاکہ اِن پر کوئی شک نہ کرے" حسن نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کک...... کیا مطلب؟ وہ لڑکا حیران ہو کر بولا۔

"اب زیادہ ایکٹنگ نہ کرو۔ اسے کہتے ہیں شکل مومناں، کرتوت کافراں۔ چلو، اُترو میری سائیکل سے اور دفع ہو جاؤ یہاں سے" میں نے اُسے حکم دیا۔

وہ بھی جھلّا گیا، بولا "آپ ہوش میں تو ہیں"؟ میری اپنی سائیکل ہے۔ آپ کی کیسے ہو گئی؟"

"اچھا تو صِرف چند گھنٹے میں یہ سائیکل تمہاری ہو گئی؟ میں کہتا ہوں، سیدھی طرح میری سائیکل میرے حوالے کر دو

ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کا ایک دوست آ گیا۔ میری بات سُن کر اُس نے کہا کہ یہ سائیکل تمہاری نہیں، اِس لڑکے فرّخ کی ہے۔ یہ سُن کر میرا پارہ اور بھی اُونچا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے میں اُس لڑکے فرّخ کو سائیکل سے گرا کر اُس سے گُتھم گُتھا ہو گیا۔ حسن نے دوسرے لڑکے کو سنبھالا۔ اِس جنگ کے دوران میں میری نظر سائیکل کے اُس حصّے پر پڑی جہاں میں نے اپنا نام کھُدوایا تھا تو وہ جگہ بالکل صاف تھی۔ ابھی میں اُس لڑکے سے اِس بارے میں کچھ پُوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک پتھّر میرے سر پر آ کے لگا اور میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔

ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں چارپائی پر پڑا تھا اور امّی، ابُّو اور بڑی بہن میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ میں نے اُنھیں ساری بات بتائی تو ابُّو نے کہا کہ تم نے خواہ مخواہ مار کھائی۔ تمہاری سائیکل تو میں نے نئے ٹائر ٹیوب ڈلوانے کے لیے مستری کو دی ہے۔ اُس سے جا کر لے آنا۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

## آج تک یاد ہے

شبانہ رسُول، بہاولنگر

جُون کی ایک چلچلاتی دوپہر کو جیسے ہی سب گھر والے سوئے، میں نے پاس لیٹی ہوئی فرزانہ کے زور سے چُٹکی لی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور گھُور کر بولی "کیا ہے؟" میں نے اُسے اِشارے سے باہر آنے کو کہا اور وہ بازُو مسلتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے باہر چلی آئی۔

"چلو، فرح کے گھر چلتے ہیں" میں نے آواز کو دھیما کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟ امّی نے منع کیا ہے کہ دھوپ میں باہر مت نکلنا۔ لُو لگ جائے گی۔ اگر اُنھیں پتا چل گیا کہ ہم اِتنی تیز دھوپ میں باہر پھرتے ہیں تو جُوتے پڑیں گے" فرزانہ نے مُنہ بنا کر کہا۔

"کوئی جُوتے وُوتے نہیں پڑیں گے۔ ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔ کسی کو علم بھی نہیں ہو گا کہ ہم لوگ باہر گئے تھے" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "میں اور فرح آج سامنے والے کھیت سے گنّے توڑنے جائیں گے۔ تم میرے ساتھ اُس کے گھر چلو۔ میں تمہارے لیے بھی گنّے لے آؤں گی" گنّے کا سُن کر فرزانہ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیّار ہو گئی۔

فرح میری بہُت پیاری دوست اور کلاس فیلو ہے۔ اُس کا گھر اگرچہ دوسری گلی میں ہے، لیکن ہمارے گھروں کی چھتیں ملی ہُوئی ہیں۔ چُوں کہ امّی نے گیٹ میں تالا لگا رکھا تھا، اِس لیے ہم چھت پر چڑھ کر دوسرے گھروں کی چھتوں پر سے ہوتے ہوئے فرح کے گھر پہنچ گئے۔ عام طور پر ہم ایک دوسرے سے ملنے کے لیے یہی راستہ اِختیار کرتے تھے۔

"میں کافی دیر سے تمہارا اِنتظار کر رہی ہوں، اور تم اب آئی ہو" فرح نے ہمیں نیچے اُترتے دیکھ کر کہا۔

"امّی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئی ہیں۔ پہلے کیسے آ جاتی؟" میں نے کہا۔

"اچھا، چھوڑو۔ آؤ، اب جلدی سے گنّے توڑ لائیں" فرح نے مجھے باہر کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

ہماری دیکھا دیکھی فرزانہ اور فرح کی چھوٹی بہنیں فوزی اور شہلا بھی باہر کو لپکیں، مگر ہم نے اُن سے کہا کہ وہ گیٹ پر کھڑے ہو کر ہمارا اِنتظار کریں۔ ہم اُن کے لیے بھی گنّے لائیں گے۔

گنّے کا کھیت فرح کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ ہم لوگ جلد ہی وہاں جا پہنچے۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھ کر تسلّی کی کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا اور پھر کھیت میں داخل ہو گئے۔ فرح نے جیسے ہی توڑنے کے لیے گنّا کھینچا، مجھے اپنے چہرے پر سُوئیاں سی چُبھتی محسوس ہوئیں اور میں نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھ مُنہ پر مارنے شروع کر دیے۔

"کیا ہُوا؟ کیا ہُوا؟" فرح نے گھبرا کر پُوچھا۔ لیکن میں مُنہ پر تھپّڑ مارے جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ زور و شور سے چیخ بھی رہی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر فرح گھر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

اب حالت یہ تھی کہ فرح میرے آگے آگے اور میں اُس

کے پیچھے پیچھے مُنہ پر تھپّڑ مارتی اور چیختی ہوئی۔

اصل میں ہُوا یہ کہ جس گنّے کو فرح نے کھینچا تھا، اُس پر بِھڑوں کا چھتّا تھا۔ بدقسمتی سے چھتّے کا رُخ میری طرف ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ بِھڑیں مجھ پر پل پڑیں۔

فرح بھاگتے ہوئے تھوڑا پیچھے مُڑ کر بولی "کیا ہُوا، شبانہ؟ کچھ بتاؤ بھی تو؟"

"بِھڑ نے کاٹ لیا ہے" میں نے درد سے بلبلاتے ہُوئے کہا۔

"کیا؟ بھُوت نے کاٹ لیا ہے؟" اُس کے مُنہ سے خوف زدہ سی آواز نکلی۔

"بِھڑ نے کاٹ لیا ہے" میں نے اُس کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہا۔ فرح صاحبہ نے اپنی رفتار اور تیز کر دی اور لگیں زور زور سے چیخنے "شبانہ کے بھُوت نے کاٹ لیا! شبانہ کو بھوت چمٹ گئے!"

اب میری حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو درد کے مارے رونا آ رہا تھا اور دوسری طرف اُس کی بے وقوفی پر ہنسی آ رہی تھی کہ میں بِھڑ کہ رہی ہوں اور وہ بیوقوف بھوت سمجھ رہی ہے۔

ہمارا شور سُن کر فرح کی امّی بھی باہر آ گئیں۔ اُنھوں نے پُوچھا "کیا ہُوا؟"

"آنٹی، بِھڑوں نے کاٹ لیا" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ آنٹی نے میرے چہرے پر پتا نہیں کیا کچھ لگایا، لیکن مجھے درد سے کسی پَل چین نہ آیا۔

خیر، میں اور فرزانہ گھر آ گئے۔ شام تک میرا چہرہ سُوج کر کُپّا ہو گیا۔ خیر سے آنکھیں تو بالکل ہی بند ہو گئی تھیں۔ امّی نے تو مجھے کچھ نہیں کہا کیوں کہ مجھے کافی سزا مل چکی تھی، لیکن بڑے بھائی بہن پوچھنے لگے "کیوں بھئی، گنّے میٹھے تھے؟" (چوتھا انعام: 35 رُوپے کی کتابیں)۔

---

بقیہ "برگد کا پیڑ"

بوڑھا کہنے لگا "اللہ تُم پر اپنی برکتیں نازل کرے۔"

وہ شام تک وہیں رہے۔ گاؤں والوں نے اُن کی خاطر مُدارت کی اور جب وہ جانے لگے تو اُنھیں ڈھیر سارا پھل بھی دیا۔

یہ سب کچھ ہُوا مگر ہر ایک اپنی جگہ حیران تھا کہ یوسُف تو ہمیں برگد کا ایک بہت پُرانا پیڑ دکھانے کے لیے لایا تھا۔ ایک بوڑھے کے پاس کیوں لے آیا؟

تانگے ابھی دُور تھے۔ یوسُف کہنے لگا "میں جانتا ہُوں، آپ حیران ہوں گے۔ حیران ہیں نا؟"

کسی نے جواب نہ دیا۔

"میں نے کہا تھا کہ ایک بہت پُرانے برگد کے پیڑ کے پاس تم کو لے جا رہا ہوں اور دیکھ لو، لے آیا ہُوں۔ دنیا میں صرف بے جان برگد ہی کے پیڑ نہیں ہوتے۔ زندہ برگد کے پیڑ بھی ہوتے ہیں۔ اور جس بوڑھے سے تم ابھی ابھی مِل کر آئے ہو، وہ ایسا ہی زندہ برگد کا پیڑ ہے۔"

یوسُف ذرا رُکا، پھر بولا "اِس بوڑھے کی عُمر اب نوّے برس کی ہو گئی ہے۔ جب یہ پندرہ برس کا تھا تو اِس نے ایک گاؤں میں بچّوں کو پڑھانا شروع کیا تھا اور اب نوّے برس کی عُمر میں بھی پڑھا رہا ہے۔ اِس کا سایہ پچھلے پچھتّر برس سے پھیل رہا ہے۔ ہزاروں بچّے اِس کے سائے میں بیٹھے ہیں۔ بچّو، تمھارے بزرگ بھی اِس کے سائے میں ضرور بیٹھے ہوں گے۔"

میاں نثار نے جھٹ سوال کیا "اِن کا نام جمال بابا تو نہیں؟"

"جی ہاں، یہی اِن کا نام ہے۔"

"میرے ابّا جی نے کئی مرتبہ اِن کا ذکر کیا تھا کہ ہمارے ہاں سینکڑوں بچّوں کو اِنھوں نے پڑھایا تھا۔"

"تو آج آپ نے دیکھ لیا نا؟ میرے دادا جی بھی اِن کے شاگردوں میں رہ چکے ہیں۔ آج کل سخت بیمار ہیں۔ چل پھر نہیں سکتے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ جمال بابا کو میرا سلام پہنچا دو۔ اور میں اِسی مقصد کی خاطر اُنھیں تلاش کر رہا تھا۔"

یوسُف خاموش ہو گیا۔

وہ سب خاموش رہے۔ دِل میں کہ رہے تھے، جمال بابا سچ مُچ زندہ برگد کے پیڑ ہیں۔

آخری قسط

# سبز پانیوں کے شہر

فوزیہ طاہرہ

بیگ والا مُعمّا تو حل ہو گیا تھا لیکن اب تشویش اِس بات کی تھی کہ سیٹھ حشمت اور قلعے میں دیکھے گئے اُس پُراسرار آدمی کا آپس میں کیا تعلّق ہے؟ اور پھر سفید گاڑی والے کون لوگ ہیں؟ شہزاد کا ننھا سا ذہن بُری طرح اُلجھ چُکا تھا۔ انکل ماجِد گھر والوں کی پریشانی دیکھ رہے تھے لہٰذا اُنھوں نے بیگ کو پھر اسی طرح بند کیا اور جمی کی امّی کو حفاظت سے رکھنے کے لیے کہا۔ وہ بچّوں کو کسی اُلجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے، کہ اُن کی سیر کا مزہ کِرکِرا نہ ہو جائے۔

"بچّو، کل آپ کو "چراکہ" کی سیر کرائی جائے گی۔" انکل ماجِد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ اُنھوں نے بچّوں کو بیگ کے بارے میں کسی سے تذکرہ نہ کرنے کو کہا، اور وردی پہن کر ڈیوٹی پر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی "چراکہ" جانے کی تیّاریاں شروع ہو گئیں۔ انکل ماجد نے مصروفیت کے باعث جانے سے معذوری کا اِظہار کیا اور شہزاد کے والِد چوں کہ اپنی ٹریننگ میں مصروف تھے، اِس لیے وہ بھی نہ جا سکے۔ لہٰذا اِس مرتبہ آنٹی زرینہ کو ہی کار ڈرائیو کرنا پڑی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد یہ مُختصر سا قافلہ کوالالپور سے کچھ دور ایک تفریحی مقام "چراکہ" جا پہنچا۔ یہاں اِسکول کی لڑکیاں خاصی تعداد میں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سفید لُنگی کُرتے میں ملبُوس تھیں اور اُن کے سر پر ہلکے آسمانی رنگ کے رُومال بندھے ہوئے بہت خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔ آنٹی ثُریّا نے بتایا کہ یہ سیر گاہ خاصی لمبی چوڑی ہے، اِس لیے حکومت نے یہاں بسوں کا انتظام کر رکھا ہے۔

سب لوگ اپنے اپنے ٹکٹ ہاتھ میں تھامے قطار میں کھڑے تھے۔ کیا مجال کہ کسی نے قطار توڑنے کی کوشش کی ہو۔ اِس پر شہزاد کو اپنے ملک کی بسیں یاد آ گئیں اور وہ آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ سب سواریاں اپنی اپنی نشست پر بیٹھی تھیں، نہ کوئی دروازے میں لٹکتا دکھائی دیا اور نہ کوئی فالتو سواری کھڑی نظر آئی۔ شہزاد کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔

بس سے اُتر کر اُنھوں نے لکڑی کے ایک چبوترے کے قریب ہی چادر بچھائی جس کے آس پاس خوش رنگ پھول کِھلے ہوئے تھے اور فوّارے چل رہے تھے۔ جمی مُنّی اور شہزاد کو اُس طرف لے گیا جہاں نُمائشی فصلیں اُگائی گئی تھیں۔ مرچ، گندُم، چاول اور مکئی کی فصلیں عجب سماں باندھ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی گاؤں میں آ گئے ہوں۔

"شہزاد، اگر یہاں سیٹھ حشمت آ جائے تو؟" جمی نے شرارت سے شہزاد کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں ــــ میں ــــ اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا" شہزاد نے ہوا میں مُکّا لہراتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اُس ملک دشمن کو پکڑنے کے لیے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہو گا۔"

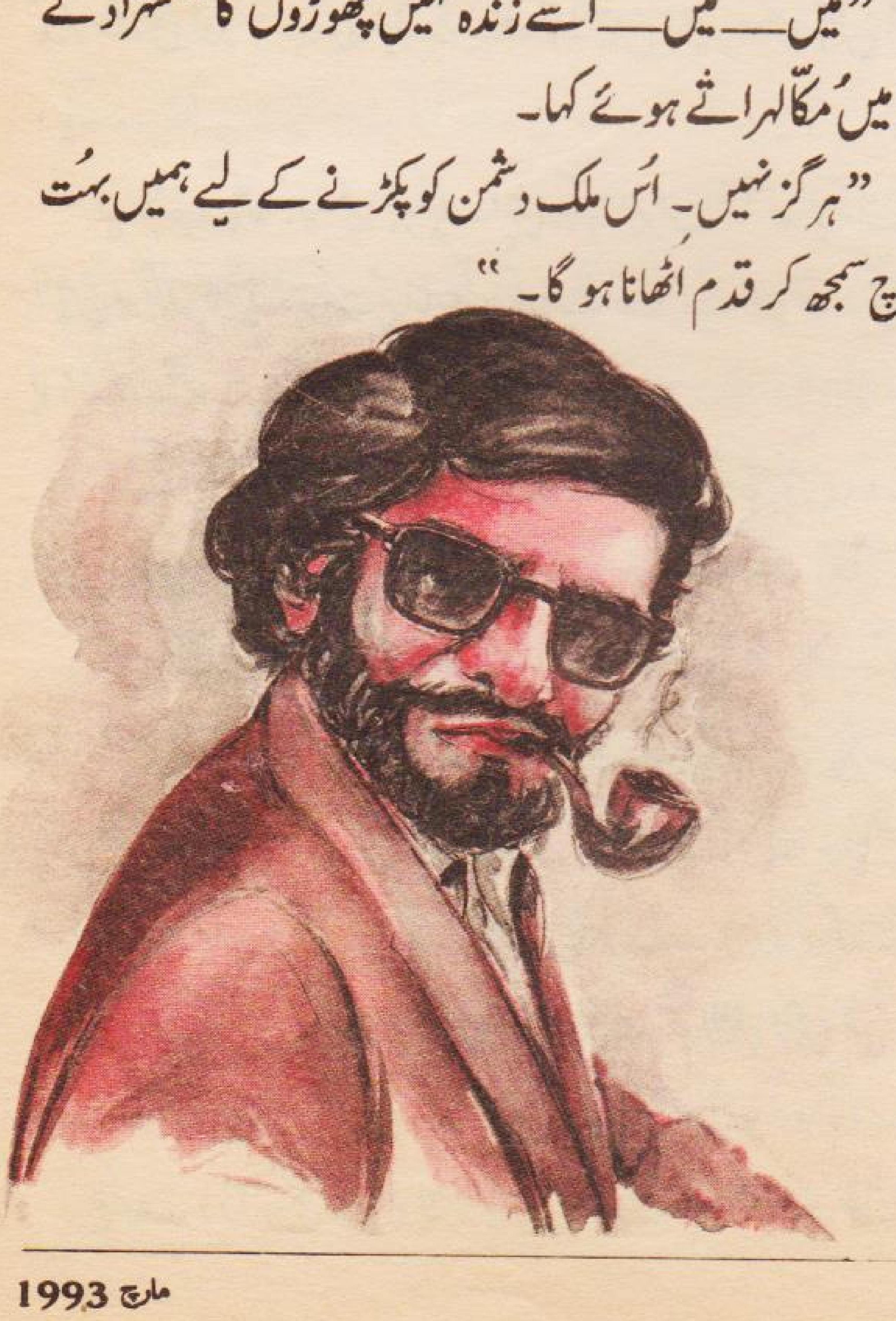

شہزاد نے جمّی کو یقین دلایا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے سیٹھ حشمت چوکنّا ہو جائے۔ اب وہ جان چکا تھا کہ سیٹھ حشمت بھیس بدل بدل کر اُس کا پیچھا کر رہا ہے تاکہ اپنا مال واپس لے سکے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

"ارے بھئی، کہاں کھو گئے؟ آؤ، اب برف باری کا منظر دیکھتے ہیں" جمّی نے شہزاد کے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ منّی حیران تھی کہ اِس اچھّی بھلی دھوپ میں برف باری کیسے ہو سکتی ہے۔ جمّی نے اپنی امّی اور آنٹی زرینہ کو بھی

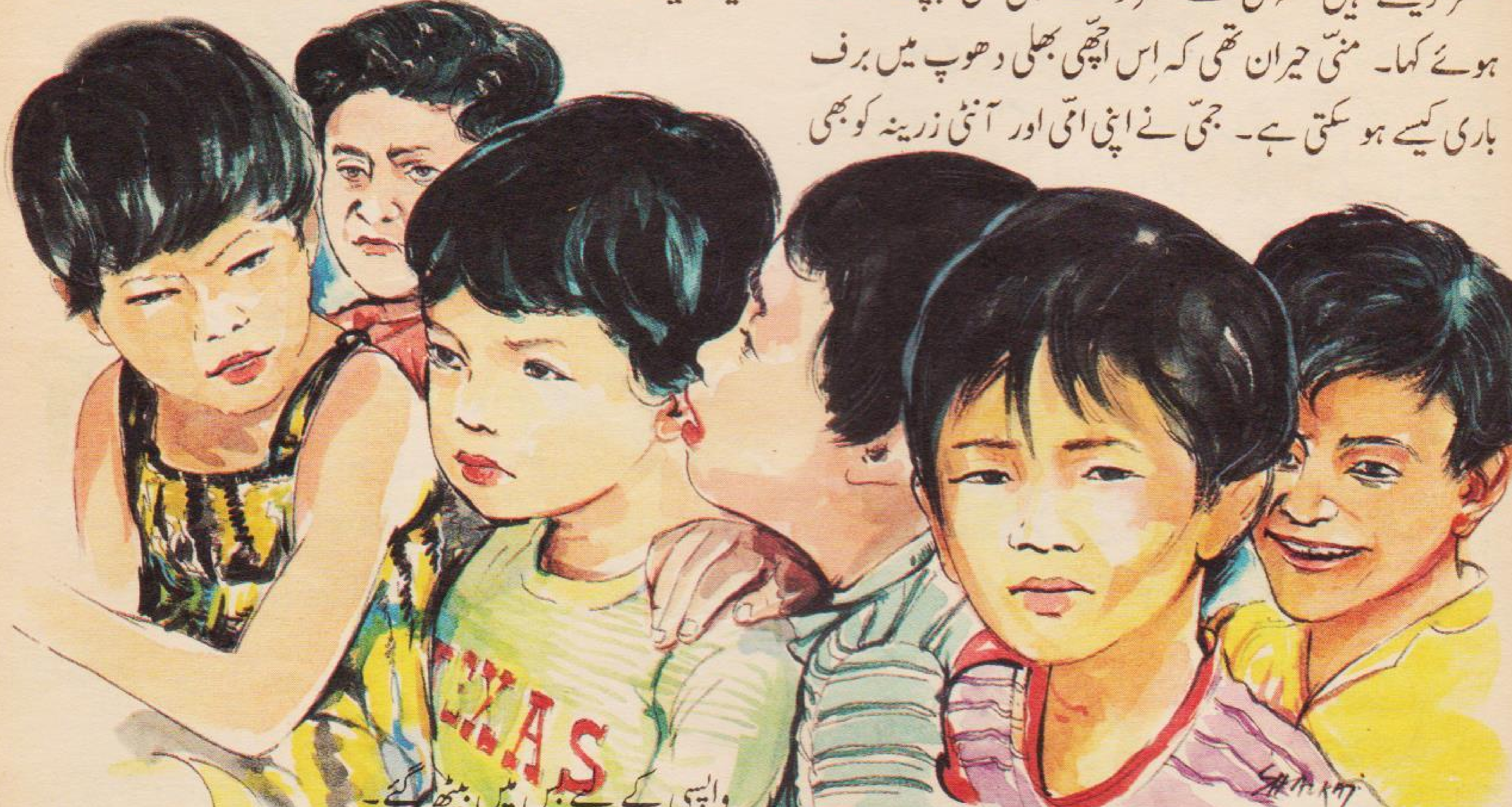

ساتھ لے لیا اور وہ چبوترے سے پانچ سو گز کے فاصلے پر بنے ہوئے ایک بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔ اِس ہال کے درمیان ایک راستہ تھا اور اِس کے دونوں طرف کیبن بنے ہوئے تھے جہاں مصنوعی برف باری کا منظر دکھایا گیا تھا۔

"امّی جان، ایسی برف باری تو ہم نے مری میں دیکھی تھی......" شہزاد نے کہا اور بھی بہُت سے لوگ یہ خوبصورت منظر دیکھ رہے تھے۔ ٹُنڈ مُنڈ درختوں پر جمی ہوئی برف روئی کے گالوں جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ سارا ہال اِیَر کنڈیشنڈ تھا، لیکن شیشے والے کیبنوں میں درجۂ حرارت منفی سے بھی کم رکھا گیا تھا۔

اِس برفیلے ہال سے باہر آئے تو دھوپ اُسی طرح اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ آنٹی زرینہ نے ایک سرسبز درخت کے نیچے چادر بچھائی اور کھانے کا سامان نکالنے لگیں۔ شہزاد کو اگرچہ مچھلی بہُت پسند تھی لیکن یہاں جب سے وہ آیا تھا، ہر کھانے کے ساتھ مچھلی ضرور ملی تھی۔ اِس جزیرہ نُما ملک کے باشندوں کی محبوب غذا مچھلی ہے، اِسی لیے ہر ریسٹورنٹ سے مچھلی کی خوش بو آتی تھی۔ آنٹی ثریّا نے پاکستانی کھانے تیار کیے تھے۔ سب نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور پھر واپسی کے لیے بس میں بیٹھ گئے۔

"چراکہ" کی سیر سے سب ہی لُطف اندوز ہوئے تھے۔ اُن کی گاڑی اب "شاہ عالَم مسجد" کی جانب جا رہی تھی جو کوالالمپور کے باہر ہے۔

"جمّی بھیّا، یہ پنّی باہر پھینک دُوں؟" مُنّی نے چاکلیٹ کا ریپر اُتارتے ہوئے کہا۔ لیکن آنٹی ثریّا نے اُسے ایسا کرنے سے منع کیا اور بتایا کہ سڑک پر کاغذ پھینکنے کا جُرمانہ 20 ڈالر ہے یعنی تقریباً 200 روپے پاکستانی۔ یہ سُن کر منّی اور شہزاد حیران رہ گئے۔ اب وہ سڑکوں کی صفائی سُتھرائی کا راز جان چکے تھے۔ مُنّی نے چاکلیٹ کی پنّی اپنے فراک کی جیب میں رکھ لی۔

گاڑی شاہ عالَم مسجد کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ لمبے چوڑے رقبے میں پھیلی ہوئی یہ مسجد سفید اور نیلے پتھر سے بنائی گئی

تھی۔ مسجد کے احاطے میں بغیر وضو داخل ہونے کی اِجازت نہیں ہے اِس لیے پہلے سب نے وضو کیا۔ مسجد کا وسیع و کُشادہ ہال خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ پہلے تو مسجد کے دربان نے اُنھیں ہال میں جانے سے روکا لیکن جب جمّی نے بتایا کہ اُس کے ساتھی پاکستانی ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اُس نے بتایا کہ اِس مسجد کا دُوسرا نام "سُلطان صلاحُ الدّین ایّوبی مسجد" بھی ہے۔ یہاں ایک وقت میں ہزاروں مسلمان نماز ادا کر سکتے ہیں۔ سوائے منّی کے سب نے یہاں عصر کی نماز ادا کی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، اِس لیے اُنھوں نے چلنے کی تیاری کی۔ اُنھیں پاکستان سے آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا لیکن شہزاد کو یُوں لگتا تھا جیسے کل کی بات ہو۔

گھر میں قدم رکھتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جمّی نے شہزاد کو فون اٹینڈ کرنے کا اِشارہ کیا، لیکن شہزاد کے ریسیور اُٹھاتے ہی کال کٹ گئی۔ اگلے ہی لمحے پھر گھنٹی بجی۔ شہزاد نے جھٹ ریسیور اُٹھایا اور بولا "ہیلو!"

"شہزاد بول رہے ہو نا؟" ایک جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔

"جی، جی۔ شہزاد ہی بول رہا ہوں۔ آپ حشمت صاحب ہیں نا؟" شہزاد سیٹھ حشمت کی آواز پہچان گیا تھا۔ جمّی بھی ریسیور کے ساتھ چپک گیا تھا۔

"انکل، آپ کی امانت بالکل محفوظ ہے۔ مجھے اپنا پتا لکھوا دیں۔ میں ابھی پہنچائے دیتا ہوں" شہزاد نے کہا۔ لیکن اچانک کال پھر کٹ گئی۔ اِس عرصے میں انکل ماجِد بھی گھر آ چکے تھے۔ شہزاد نے اپنے والِد کو فون والا قصّہ سُنایا اور اُنھوں نے انکل ماجِد کو بتا دیا۔ جمّی اور شہزاد کو رات بھر فون کا اِنتظار رہا۔ اُنھیں یقین ہو چلا تھا کہ اب اِس ڈرامے کا خاتمہ ہونے کو ہے۔

اگلے دن جُمعے کو کوالالمپور کی اہم سیر گاہیں دیکھنے کا پروگرام بنایا گیا۔ شہزاد کے والِد کو اُن کے ایک دوست نے لنچ پر بُلا رکھا تھا، اِس لیے وہ تو وہاں چلے گئے اور یہ مُختصر سا قافلہ آنٹی ثریّا کے ساتھ "سنٹرل میوزیم" کی طرف چل دیا۔

میوزیم کے مین گیٹ پر ایک بہت بڑے بن مانس کا مُجسّمہ لگا ہوا ہے۔ اور بھی بہت سے سیّاح میوزیم میں آئے ہوئے تھے۔ میوزیم کا مین ہال سنگِ مرمر کی اُن ٹائلوں سے بنایا گیا تھا جو پاکستان نے ملائیشیا کو تحفے میں دی تھیں۔ یہ جان کر شہزاد کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔

آنٹی ثریّا اُنھیں لے کر ہال کے بائیں جانب گئیں جہاں مسلمانوں کے لباس اور رسم و رواج سے مُتعلّق اشیا رکھی تھیں۔ وہ پورے ہال کا چکّر لگانے کے بعد مین ہال سے گزرتے ہوئے دائیں جانب والے ہال میں چلے گئے، جہاں کا ماحول اِنتہائی پُراَسرار بنایا گیا تھا۔ یہاں قدیم زمانے کے اِنسانوں کی وہ کھوپڑیاں رکھی ہوئی ہیں جو پُرانے کھنڈروں سے برآمد ہوئی تھیں۔ یہ کھوپڑیاں رنگ برنگی روشنیوں کے بیچ بڑی خوفناک لگ رہی تھیں۔ مُنّی نے تو ڈر کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

میوزیم سے نکلے تو مُنّی نے بَرڈ پارک (پرندوں کا پارک) دیکھنے کی رٹ لگا دی۔ لہٰذا دس منٹ کے اندر اندر سب برڈ پارک پہنچ گئے۔ یہ پارک یا چڑیا گھر دو پہاڑیوں کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اِس کے اُوپر بھی، بٹر فلائی پارک کی طرح، ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک ایک سبز رنگ کی جالی تنی ہوئی

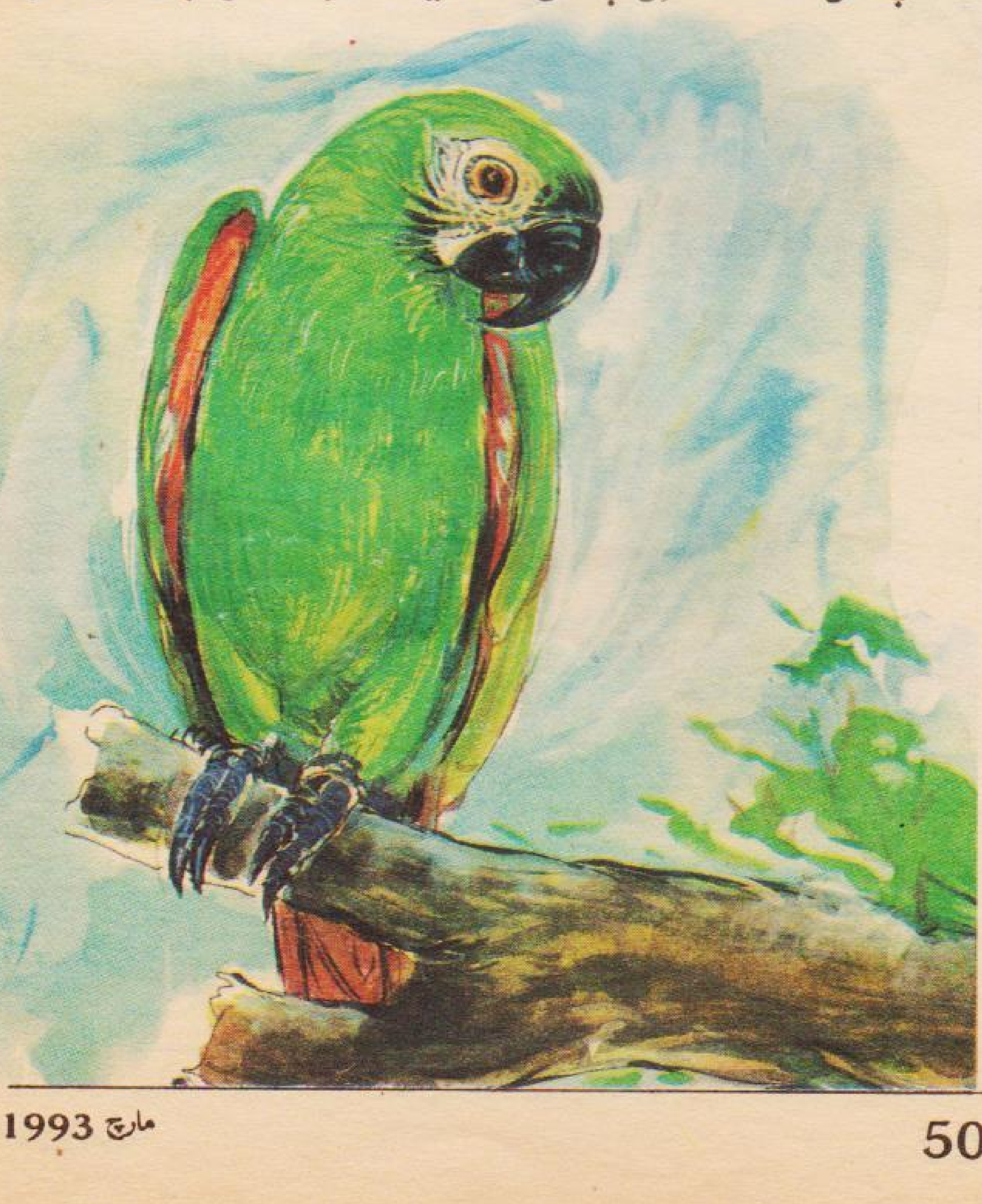

تھی تاکہ پرندے اُڑ کر کہیں اور نہ جا سکیں۔ مُنّی رنگ برنگے طوطوں کو دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ اِس چڑیا گھر میں ایسے پرندے تھے جو منّی اور شہزاد نے اِس سے پہلے نہ کبھی دیکھے تھے اور نہ کتابوں ہی میں پڑھے تھے۔

"اب ہم "ڈیئر پارک" دیکھیں گے" برڈ پارک سے باہر نکل کر جمی نے منّی کو بتایا۔ پچاس گز کے فاصلے پر کئی کنال پر پھیلا ہوا ڈیئر پارک تھا جہاں صرف Deers یعنی ہرن ہی ہرن تھے۔ بچّے یہ پارک دیکھ کر بہُت خوش ہوئے۔ اِس پارک کے قریب ہی ملائیشیا کے دوسرے وزیرِاعظم تُن عبدُالرّزاق مرحوم کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ اِس کے برآمدے میں اس عظیم شخصیّت کی کار کھڑی کی گئی ہے۔ اندر

ہال میں اُن کی یادگار چیزیں رکھی گئی ہیں، جن میں کتابیں، تحفے تحائف اور خاص خاص موقعوں پر کھینچی گئی تصویریں شامل ہیں۔

"ملائیشیا کی ترقّی کا آغاز تُن عبدُالرّزاق کے زمانے سے ہُوا۔ اِس لیے اُنہیں "بابائے ترقّی" کہا جاتا ہے" آنٹی ثُریّا نے بتایا۔

اِس عمارت سے باہر آئے تو دھوپ کی جگہ بادلوں نے لے لی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مُوسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اب مزید سیر ممکن نہ تھی لہٰذا انہوں نے واپسی میں ہی عافیّت سمجھی اور تقریباً 4 بجے گھر لوٹ آئے۔

گھر میں قدم رکھا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "ہیلو!" شہزاد نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"برڈ پارک کیسا لگا، بیٹا؟" پھر وہی جانی پہچانی آواز سُنائی دی۔ شہزاد کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ وہ حیران تھا کہ سیٹھ حشمت کو کیسے پتا چل گیا کہ اُنھوں نے آج برڈ پارک کی سیر کی ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ لائن کٹ گئی۔

جمّی نے اپنے مہمانوں کی خاطر اِسکول سے چھُٹیاں لے رکھی تھیں اور آج اُس کی چھٹّی کا آخری دن تھا، لہٰذا نگارا مسجد دیکھنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اُنھوں نے نگارا مسجد کا رُخ کیا۔ اگرچہ شہزاد نے اپنے ملک میں بھی بڑی بڑی عمارتیں دیکھی تھیں، لیکن یہاں تو ہر طرف کئی کئی منزلہ جدید طرز کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں، اور تقریباً ہر سرکاری عمارت پر 2020 لکھا ہُوا تھا۔ آخر شہزاد سے رہا نہ گیا اور اُس نے اِن ہندسوں کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ منّی جھٹ بول اُٹھی کہ یہ ملائیشیا کے بادشاہ کا فون نمبر ہو گا۔ یہ سُن کر سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

آنٹی ثریّا نے بتایا کہ یہ 1993ء کا سال ہے۔ 27 سال بعد یعنی 2020ء میں یہ ملک ترقّی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ اِس لیے ہر سرکاری عمارت پر 2020 لکھ دیا گیا ہے تاکہ ملائیشیا کا ہر شخص خوب محنت کرے۔

اچانک شہزاد کی چھٹی حِس جاگی۔ اُس نے ایک دم پیچھے مُڑ کر دیکھا اور جمّی سے کہا "وُہی سیاہ گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی ہے!" لیکن اِس سے پہلے کہ جمّی دیکھتا، گاڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ شہزاد اور جمّی حیران تھے کہ اب سفید گاڑی کی

بجائے سیاہ گاڑی اُن کا پیچھا کر رہی ہے۔

" نگارا مسجد ملائیشیا کی قومی مسجد ہے" آنٹی ثریّا نے مسجد کے جنگلے کے قریب کار روکتے ہوئے کہا۔ سب نے جوتے اُتارے اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ یہ مسجد اِسلامی طرزِ تعمیر کا ایک نادِر نمونہ ہے۔ اِس کے وسیع ہال کو قُرآنی آیات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اِس کے مینار 73 میٹر بلند ہیں۔ سفید سنگِ مرمر کے فرش اِتنے صاف شفّاف تھے کہ پاؤں پھِسلا جاتا تھا۔ منّی تو کئی بار گرتے گرتے بچی۔ مسجد کے اِحاطے میں پام کے درخت اُس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔

اب شام ہونے کو تھی۔ شہزاد یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ گھر میں قدم رکھتے ہی پھر فون پر فون آنا شروع ہو جائیں گے۔ لیکن اِتّفاق کی بات گھر پہنچنے کے بعد کوئی فون نہیں آیا۔

جمّی اور شہزاد کو اِس بات پر بڑی حیرت تھی کہ انکل ماجد نے حشمت اِسمگلر کے کیس میں کسی خاص دِلچسپی کا مُظاہرہ نہیں کیا تھا اور نہ بیگ والے واقعے کے بعد اُن سے اِس بارے میں کوئی تذکرہ کیا تھا۔ جمّی آج جلد ہی بستر پر لیٹ گیا کیوں کہ صبح اُسے اِسکول جانا تھا۔ شہزاد اُس کے ساتھ جانا چاہتا تھا. اِس لیے اُسے بھی زبردستی آنکھیں مُوندنا پڑیں۔

گھڑی نے ابھی صبح کے پورے چھ بھی نہیں بجائے تھے کہ جمّی شہزاد کے سر پر آدھمکا۔

"ابھی تو چھ بھی نہیں بجے ـــــ ہمیں تو اِسکول آٹھ بجے جانا ہے" شہزاد نے دیوار پر لگے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم ایک گھنٹا پہلے اِسکول جائیں گے" جمّی نے شہزاد کے اُوپر سے کمبل اُتارتے ہوئے کہا اور خود مُنہ ہاتھ دھونے چلا

گیا۔ پورے سات بجے جمّی تیار ہو چکا تھا، لیکن شہزاد ابھی ناشتا ہی کر رہا تھا کہ اِسکول کی وین نے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ شہزاد نے جلدی جلدی نِوالے نِگلے اور دونوں دوست وین میں جا بیٹھے۔ وین میں اور بھی لڑکے بیٹھے تھے۔ "سلامت پاگی" کہ کر ایک لڑکے نے شہزاد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شہزاد اگرچہ کچھ سمجھ نہ سکا لیکن اُس نے بھی مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جمّی نے اُسے بتایا کہ یہ صبح کا سلام ہے۔ شہزاد نے سلامت پاگی کو بار بار دُہرایا تاکہ اِسکول جا کر سب بچّوں کو اُن کی زبان میں سلام کرے۔

دس مِنٹ کا راستہ لمحوں میں طے ہو گیا۔ سب لڑکے ایک قطار میں وین سے اُترے اور اِسکول کے اندر چلے گئے۔ پہلے دُعا پڑھی گئی اور پھر لڑکے قطار کی صورت میں اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ جمّی نے اپنی کلاس کے لڑکوں سے شہزاد کا تعارُف کرایا۔ شہزاد سلامت پاگی کہ کر ہاتھ بڑھاتا تو وہ سب خوشی سے تالیاں بجاتے۔

کلاس رُوم میں جمّی کے ماسٹر صاحِب آئے تو لڑکے کھڑے ہو گئے اور اُنھیں ادب سے سلام کیا۔ ماسٹر صاحِب بھی شہزاد کے ساتھ اِنتہائی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور بڑی سلیس اُردو میں اُسے بتایا کہ اِس ملک میں پرائمری تک تعلیم مُفت دی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم قومی زبان مَلائی ہے۔ پاکستان کی طرح ایسا نہیں ہے کہ امیروں کے بچّے اِنگلش میڈیم اِسکول میں پڑھیں اور غریبوں کے، بچّے اُردو میڈیم اِسکول میں۔ ماسٹر صاحِب نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اِس ملک کی زبان یعنی مَلائی رومن رسُم الخط (انگریزی حروف) میں لِکھی جاتی ہے۔

شہزاد حیران تھا کہ ماسٹر صاحب نے اِتنی اچھی اُردو کہاں سیکھی۔ اُسے حیران دیکھ کر جمّی نے بتایا کہ ماسٹر صاحِب پاکستانی ہیں اور دس بارہ سال پہلے یہاں آئے تھے۔

اِتنے میں اِسکول کا چوکی دار شہزاد کے پاس آیا اور اُسے ایک رُقعہ دے کر چلا گیا۔ شہزاد نے رُقعہ کھول کر دیکھا تو اُس کے آخر میں "ح۔ خ" لکھا ہوا تھا ـــــ شہزاد کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ یقیناً حشمت خاں ہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے شہزاد کو کل 2 بجے دوپہر سنٹرل مارکیٹ میں ایک بیگوں والی دُکان پر اپنا بیگ لانے کو کہا تھا۔ اور یہ بھی تاکید کی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

شہزاد نے جمّی کو رُقعہ دِکھایا اور پھر اُسے تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ چھُٹی کے بعد دونوں گھر آ گئے۔ شہزاد سمجھ گیا تھا کہ سیٹھ حشمت سائے کی طرح اُس کا پیچھا کر رہا ہے اور کسی شخص کی موجودگی میں اُس سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے اپنی والِدہ سے اِس واقعے کا تذکرہ کیا۔ جمّی کی امّی بھی اُس کی باتیں سُن رہی تھیں۔ اُنھوں نے اُسے تسلّی دی اور کل دو بجے سنٹرل مارکیٹ جانے کی تاکید کی۔

اگلے دن انکل ماجد وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر چلے گئے۔ شہزاد کا دھیان بار بار گھڑی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پورے ڈیڑھ بجے بیگ اُٹھا کر گھر کے گیٹ پر آ کھڑا ہُوا اور ٹیکسی کا اِنتظار کرنے لگا۔ اُس نے سوچا تھا کہ جب سیٹھ حشمت بیگ لینے کے لیے آئے گا تو وہ شور مچا دے گا اور یوں آسانی سے وہ گرفتار ہو جائے گا۔

اِتنے میں ایک ٹیکسی اُس کے قریب آ کر رُکی۔ شہزاد نے ڈرائیور کو انگریزی میں سنٹرل مارکیٹ چلنے کو کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ سنٹرل مارکیٹ کے دائیں جانب بیگوں کی ایک دُکان تھی۔ شہزاد نے ٹیکسی ڈرائیور کو اِشارے سے رُکنے کے لیے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن کہیں بھی حشمت خان یا اُس سے مِلتا جُلتا کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ اُس نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور خود بیگوں والی دُکان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"شہزاد!" ایک بھاری بھرکم ہاتھ شہزاد نے اپنے کندھے پر محسوس کیا، اور پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ تو کوئی سردار جی تھے، جن کا چہرہ گھنی ڈاڑھی مونچھوں میں چُھپا ہوا تھا اور سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ شہزاد کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر بولے "بیگ اُس سفید گاڑی میں رکھ آؤ اور

فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ پلٹ کر مت دیکھنا!"

شہزاد سردار جی کو پہچان گیا تھا۔ یہ حشمت خاں تھا۔ اُس وقت اُس نے شور مچانا مُناسب نہ سمجھا، کیوں کہ ہیروئن والا بیگ اُس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور پولیس اُسے بھی پکڑ سکتی تھی۔ اُس نے چُپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی اور سڑک کے دوسری جانب کھڑی سفید گاڑی میں بیگ رکھ دیا۔ گاڑی کے اندر کوئی بھی نہ تھا۔ اُس نے حشمت خاں کی ہدایت کے مُطابق پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور بس اِسٹاپ کی طرف چل دیا۔ لیکن ابھی چند قدم ہی بڑھا تھا کہ چاروں طرف سے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ اور پھر پولیس کی گاڑیاں دکھائی دیں۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھا ہی چاہتا تھا کہ اُسے پیچھے سے اپنے ابّو کی آواز سُنائی دی۔ وہ کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے چلّا کر کہا "ارے! یہ تو میرے گھر والے ہیں، مگر یہاں کیسے؟" وہ پُھرتی سے کار کی طرف بڑھا۔ کار میں اُس کی والِدہ اور منّی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ راستے میں اُسے ابّو نے بتایا کہ اُسے اِس مِشن پر اکیلا بھیجا گیا تھا لیکن در حقیقت سب اُس کے ساتھ تھے۔ یہاں تک کہ سیاہ گاڑی میں انکل ماجد ہی بھیس بدل کر اُس کی حفاظت کر رہے تھے اور ٹیکسی والا بھی پولیس ہی کا ایک آدمی تھا۔ اِس وقت انکل ماجد نے پولیس کے ساتھ سنٹرل مارکیٹ کو گھیرے میں لے لیا ہے اور سیٹھ حشمت بس پکڑا ہی جانے والا ہے۔

گھر پہنچے ہی تھے کہ انکل ماجد کا فون آگیا۔ اُنھوں نے سیٹھ حشمت کی گرفتاری کی خوش خبری سُنائی۔ شہزاد کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آ گئے۔ جمّی نے اُسے گلے لگا لیا۔ بیگم زرینہ اُس کی بلائیں لینے لگیں۔ شام کو انکل ماجد گھر آئے تو اُنھوں نے بتایا کہ حشمت بہُت بڑا اِسمگلر ہے اور اُس کے پاس کئی ملکوں کے جعلی پاس پورٹ ہیں۔ اب وہ سزائے موت سے نہیں بچ سکے گا کیوں کہ ملائیشیا میں ہیروئن اِسمگل کرنے والوں کی سزا موت ہے۔ شہزاد نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اُس کی وجہ سے ایک شیطان اپنے انجام کو پہنچا۔

اگلے دن پولیس ہیڈکوارٹر میں ایک تقریب ہوئی جس میں کوالالمپور کے اِنسپکٹر جنرل پولیس نے جمّی اور مُنّی کو حوصلہ افزائی کے سرٹیفکیٹ دیے اور شہزاد کو سونے کا تمغہ دیا، جو اُس کی جرأت اور بہادری کا اِنعام تھا۔ تقریب سے فارغ ہو کر انکل ماجد سب کو شاپنگ کے لیے لے گئے۔ اُنھوں نے اپنے پاکستانی مہمانوں کو چائنا ٹاؤن، مال اور سنٹرل مارکیٹ کی سیر کرائی اور اُن کی پسند کے تحفے بھی خریدے۔ شہزاد اور منّی اِتنے بڑے بڑے شاپنگ پلازہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

آج اِس شہر میں اُن کا آخری دن تھا اور کل صبح واپس پاکستان جانا تھا۔ گھر پہنچتے ہی پیکنگ کا کام شروع ہو گیا۔ شہزاد کو انکل ماجد کی زبانی یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اِس ملک میں لوگوں کو گلی بازاروں میں سگرٹ پینے کی اِجازت نہیں ہے۔ اِسی طرح موٹر سائیکل سوار کے لیے خواہ عورت ہو یا مرد، ہیلمٹ پہننا ضروری ہے۔ بیگم زرینہ کو بھی یہ ملک اور اِس ملک کے لوگ بہُت پسند آئے تھے۔

دن چڑھتے ہی روانگی کی تیاّریاں شروع ہو گئیں۔ جلدی جلدی گاڑی میں سامان لادا گیا۔ تمام راستے شہزاد ہاتھ ہلا ہلا کر سر سبز درختوں کو خدا حافظ کہتا رہا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بھی لہرا لہرا کر اُسے الوداع کہ رہے ہوں۔ اُس نے اپنے سینے پر سجے تمغے کو آنکھوں سے لگایا اور خوشی سے اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ گاڑی فراٹے بھرتی اِیئر پورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔

(ختم شد)

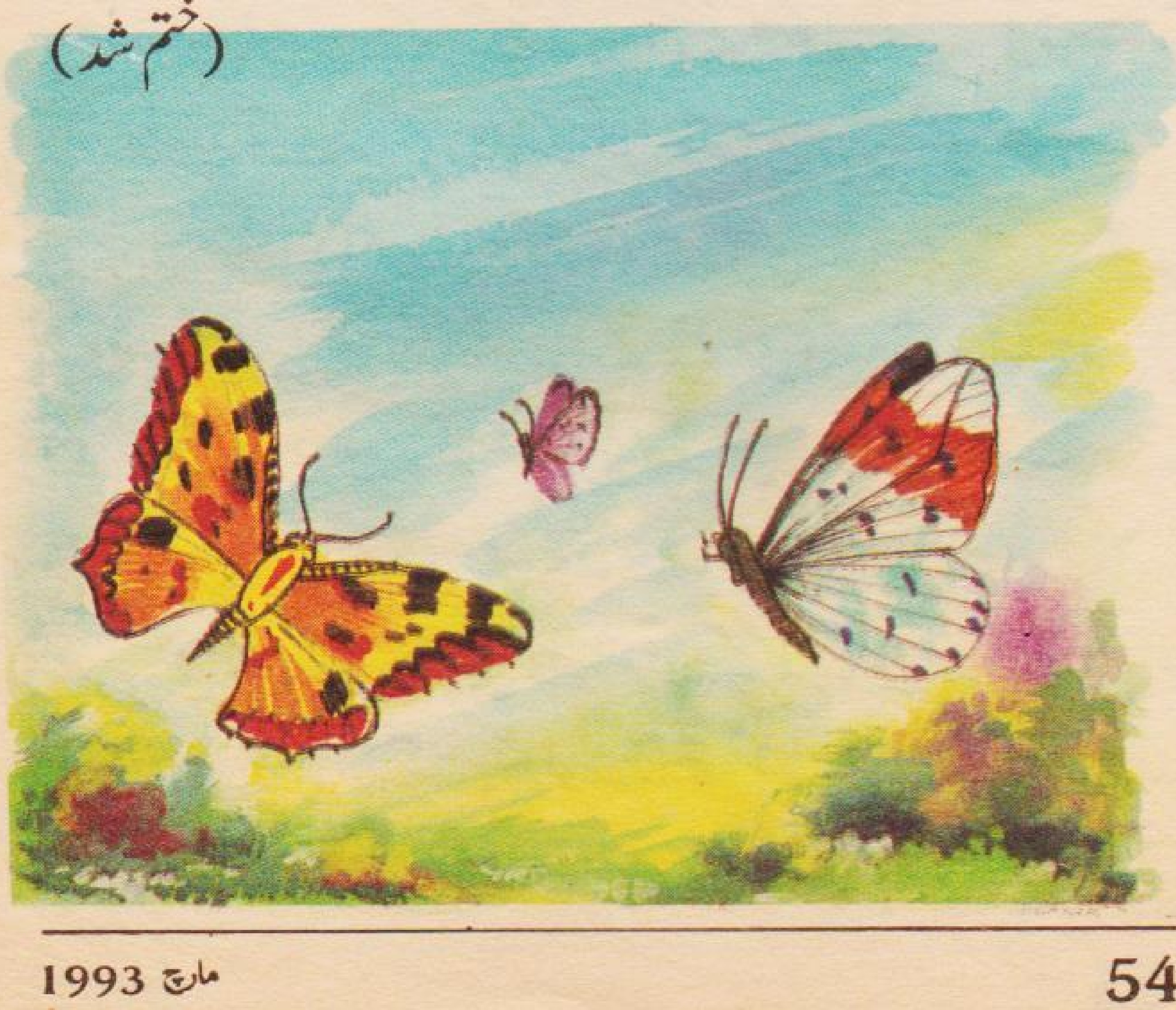

تصویر کا سائز : 6"×9"

## چاند کی سیر

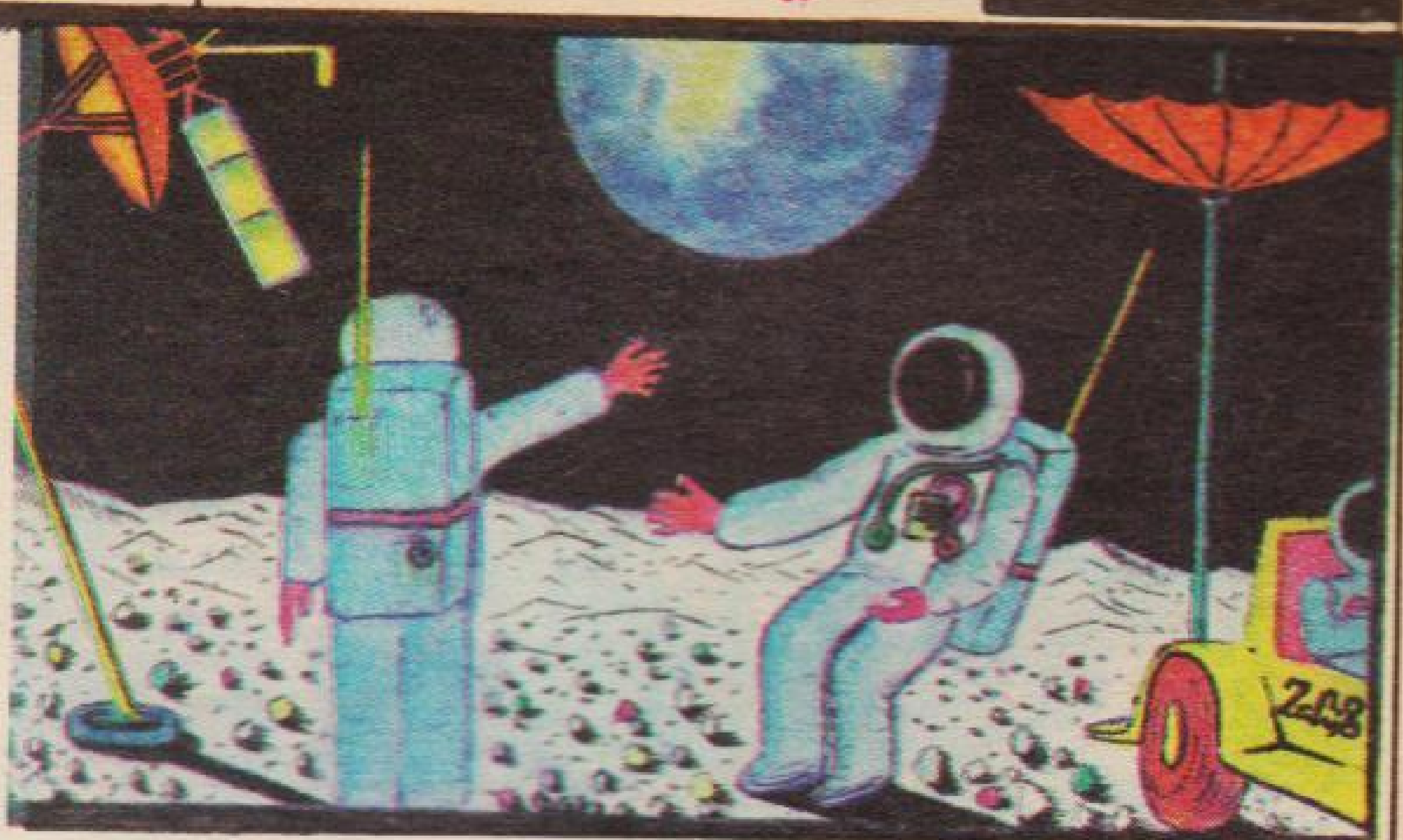

زاہد منان قریشی۔ چترپڑی (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

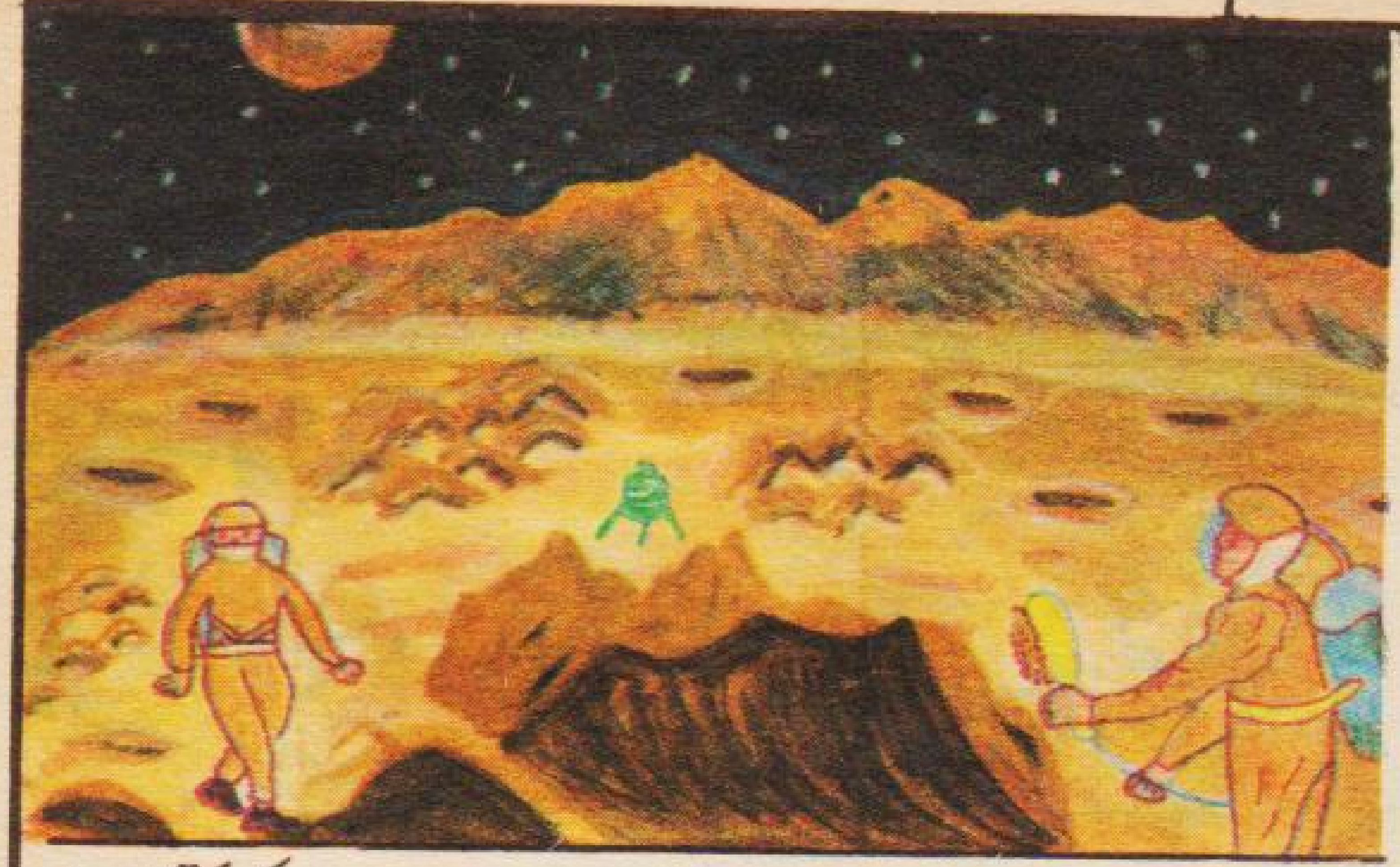

ذوالقرنین شاہین ٹبی لنڈان (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

دُرِ ثمین کراچی یونیورسٹی کیمپس (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

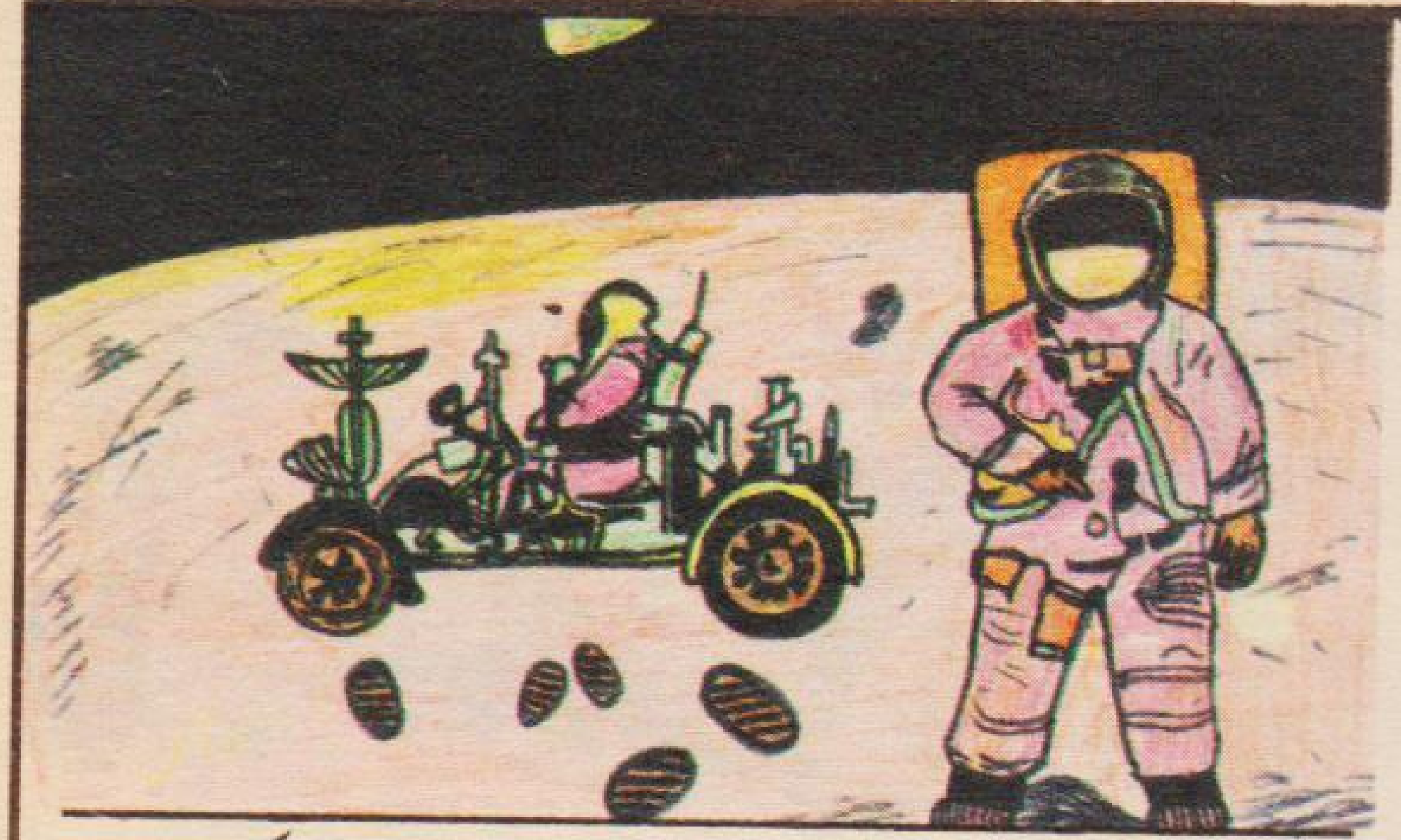

حماد مجید جنجوعہ فیصل آباد (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

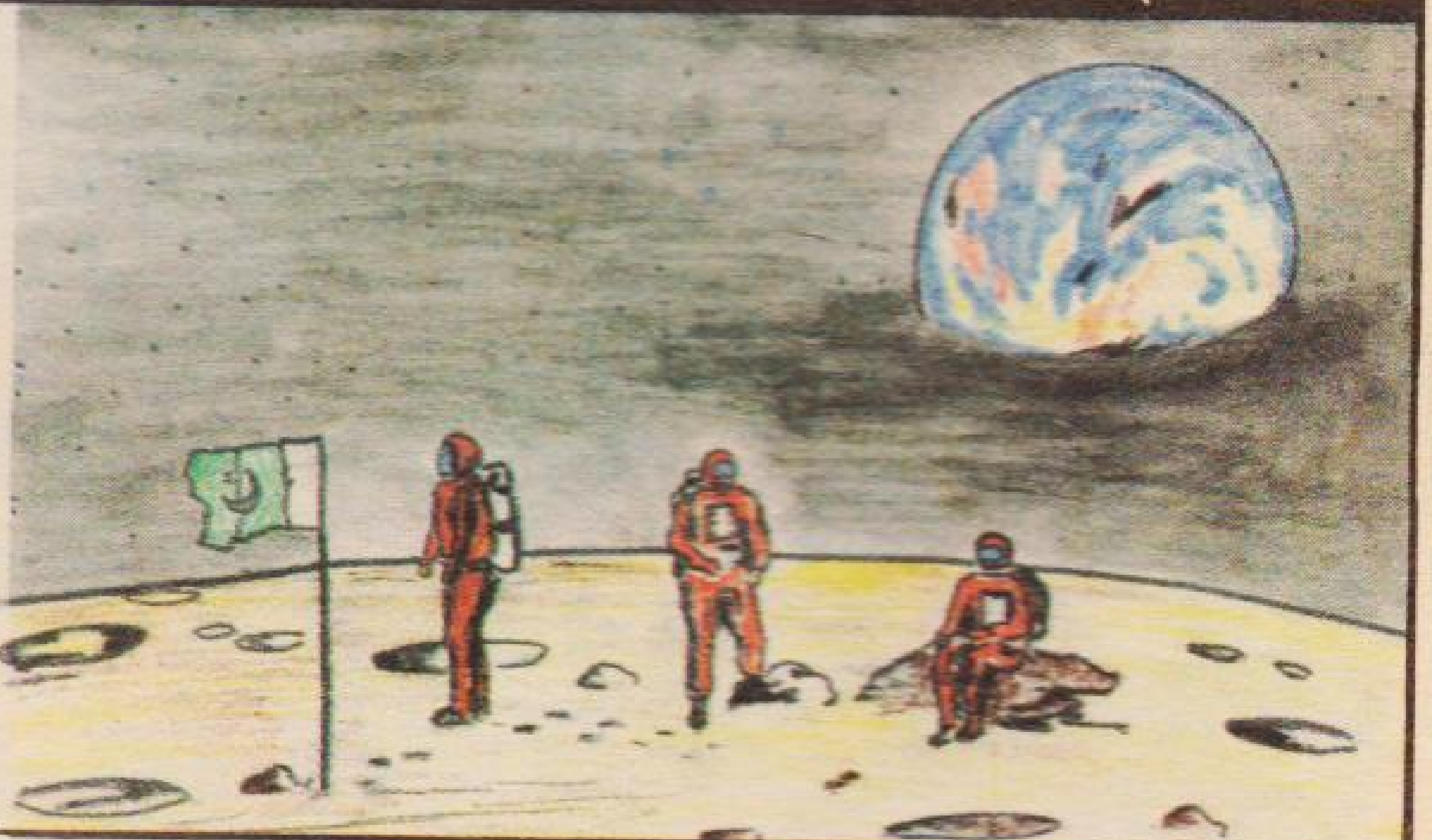

جعفر حسین جعفری کوئٹہ (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

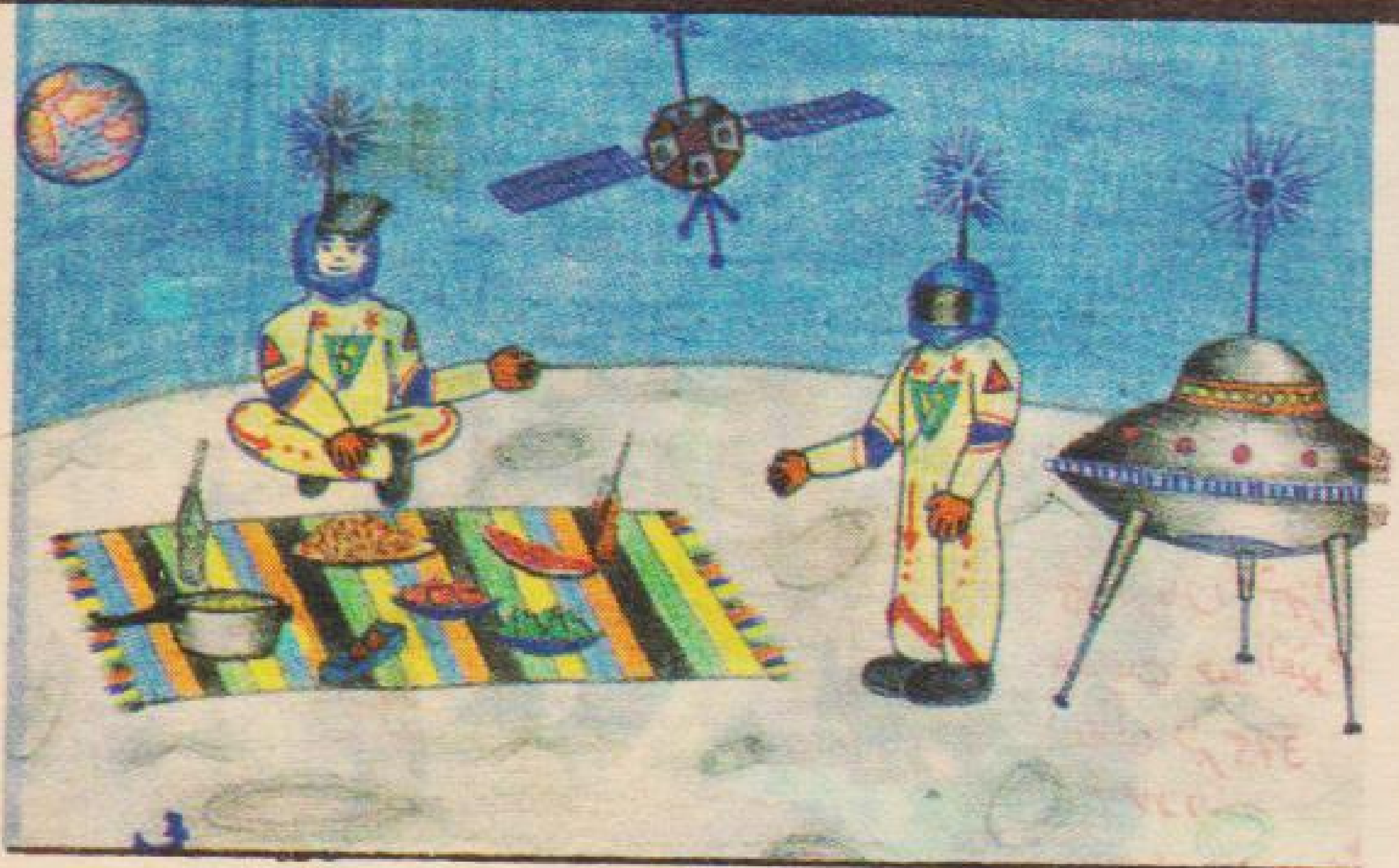

محمدؐ عرفان شنزاد مردان (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

انیس احمد کراچی۔ نسرین بی بی کراچی۔ محمدؐ سعید خان کراچی۔ فیصل رضا لاہور۔ عُمر بادشاہ پشتون گڑھی۔ محمدؐ عمران لاہور۔ عتیقُ الرحمٰن پشاور۔ توصیف ظفر پشاور۔ نورین نزار علی کراچی۔ محمدؐ سلیم کاموکی۔ فرح ناز جہلم۔ عادل زُبیر موہری شریف۔ ذیشان نعیم اِسلام آباد۔ اسدُ الزّماں ٹیپو کاموکی۔ الیاس بادشاہ پشتون گڑھی۔ عمران یوسُف راولپنڈی۔ ندیم اصغر موہری شریف۔ سعدیہ صِدّیق لاہور۔ فریحہ عثمان لاہور۔ فریال نواز جھنگ صدر۔ عبداللہ عرفان ڈیرہ اسماعیل خان۔ جاوید الرحمٰن، بکن کرم ایجنسی۔ طیبّہ آصف صادق آباد۔ سلمان عارف بہاولپور۔ فضل بادشاہ پشتون گڑھی۔ سعدیہ سونش کراچی۔ عبدالاحد قریشی چترپڑی آزاد کشمیر۔ نوشین نزار علی کراچی۔ مقصود ر حمان لاہور۔ وقاص عبدالرؤف لاہور۔

آخری تاریخ 10 مارچ

اپریل: پکنک

مئی: ریلوے پلیٹ فارم

آپ اِن موضوعات میں سے جِس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں۔

# نواب وزیر خاں 1570-1640ء

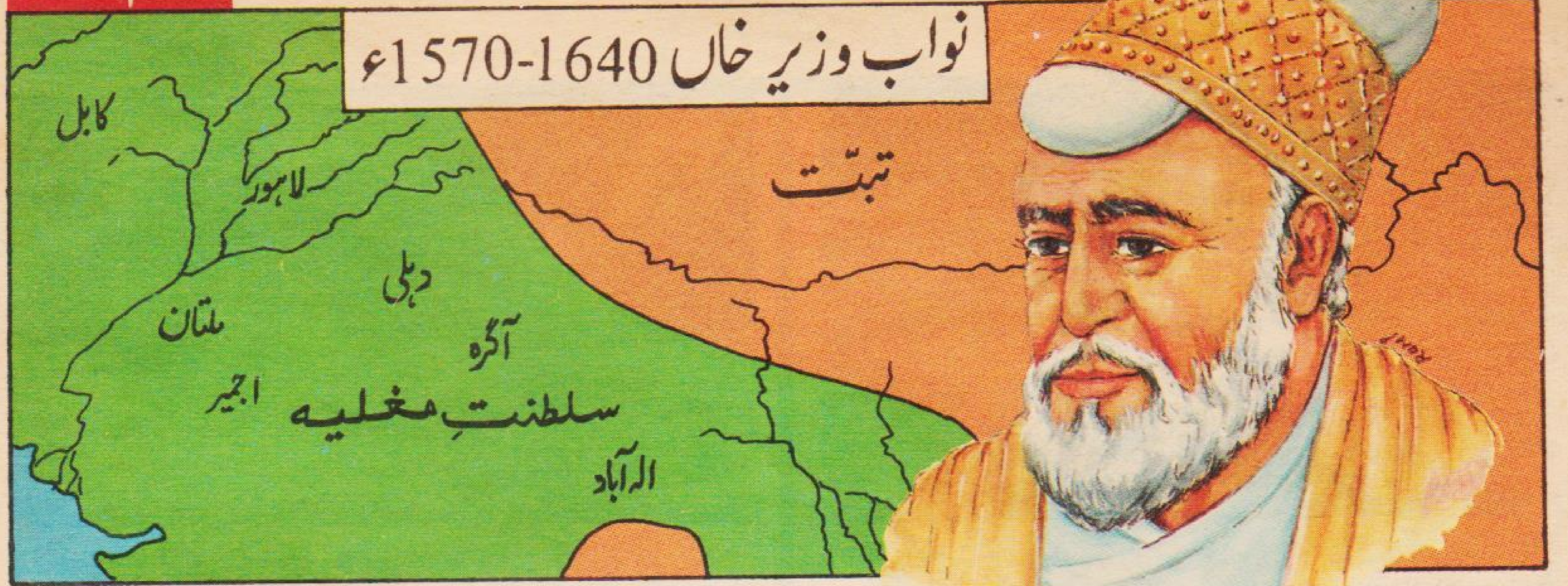


نواب وزیر خاں کا اصل نام علم دین تھا۔ آپ مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں پنجاب کے قصبے چنیوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبے میں ہی حاصل کی۔ عربی فارسی کے علاوہ علمِ طب میں بھی خاص مہارت حاصل کر لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد روزگار کا مسئلہ سامنے آیا۔ بہت کوشش کی لیکن گزارے کی کوئی راہ نہ نکل سکی۔ آخر تنگ آکر روزگار کی تلاش میں دارالسلطنت آگرہ کی راہ لی۔ اس وقت شہنشاہ جہانگیر تخت نشین تھا۔ آگرہ میں قسمت نے ساتھ دیا اور آپ کی حکمت کا کام چل نکلا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ انہی دنوں شہزادہ خرم جو کہ بعد میں شاہجہان کے نام سے تخت نشین ہوا بیمار پڑ گیا۔ بہتیرا علاج کرایا گیا لیکن کسی طرح آرام نہ آیا۔ آخر کسی درباری نے حکیم علم دین کو آزمانے کا مشورہ دیا۔ حکیم صاحب کو شاہی محل میں بلایا گیا۔ جب قسمت کو منظور ہو تو کامیابی کی راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ حکیم صاحب نے علاج شروع کیا اور خدا نے شہزادے کو صحت عطا کر دی۔ شہنشاہ جہانگیر بہت خوش ہوا اور حکیم صاحب کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا اور ساتھ ہی آپ کو شہزادے کا مصاحب مقرر کر دیا۔

شہزادہ حکیم صاحب کی دیانت اور ذہانت سے اتنا خوش ہوا کہ 1621ء میں انہیں نواب وزیر خاں کے خطاب سے نوازا اور اپنے ذاتی محافظوں کا داروغہ مقرر کر دیا۔ 1627ء میں جہانگیر کی وفات کے بعد جب شاہجہان تخت نشین ہوا تو اس نے نواب وزیر خاں کو بیش بہا انعام و اکرام کے علاوہ شاہی دربار میں پنج ہزاری کا عہدہ دیا اور دارالسلطنت کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ اسی طرح مختلف وقتوں میں آپ کو پنجاب اور آگرے کی صوبیداری کے فرائض سونپے گئے۔

نواب وزیر خاں کو فنِ تعمیر سے خاص دلچسپی تھی اور آپ نے اپنے پیچھے بیشمار یادگاریں چھوڑی ہیں۔ وزیر آباد کا شہر آپ نے ہی آباد کیا تھا۔ آپ نے عام لوگوں کے فائدے کے لیے جگہ جگہ سرائیں، باغ، مسجدیں اور تالاب وغیرہ تعمیر کروائے۔ اپنے آبائی قصبے چنیوٹ میں بھی پختہ فصیل، کئی ایک عمارتیں، بازار، سرائیں، شفاخانے، تالاب، مسجدیں اور کنوئیں وغیرہ تعمیر کروائے۔ لاہور میں جہاں آپ اپنی پنجاب کی صوبیداری کے دوران میں قیام پذیر رہے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بیشمار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ موجودہ دہلی دروازے کے قریب آپ نے ایک شاندار سرائے تعمیر کرائی تھی جو اب موجود نہیں لیکن اس میں بنایا گیا شاندار حمام اور مسجد آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح ٹکسالی دروازے کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس کے نقش و نگار آج بھی قابلِ دید ہیں۔ آپ کی ذاتی رہائش کی حویلی شاہ عالمی بازار میں تھی۔ اس کے نواح میں تعمیر کرائی گئی مسجد آج بھی موجود ہے۔ آپ نے موجودہ انار کلی کے علاقے میں ایک شاندار باغ لگوایا تھا۔ وہ باغ تو اب ختم ہو چکا ہے لیکن اس میں تعمیر کردہ بارہ دری کی عمارت پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ لیکن آپ کی سب سے مشہور یادگار مسجد وزیر خاں ہے جو کہ دہلی دروازے کے اندر واقع ہے اور فنِ تعمیر، نقش و نگار اور خطاطی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

آپ نے 1640ء میں جب آپ آگرے کے صوبیدار تھے وفات پائی۔

عین الحق فرید کوٹی

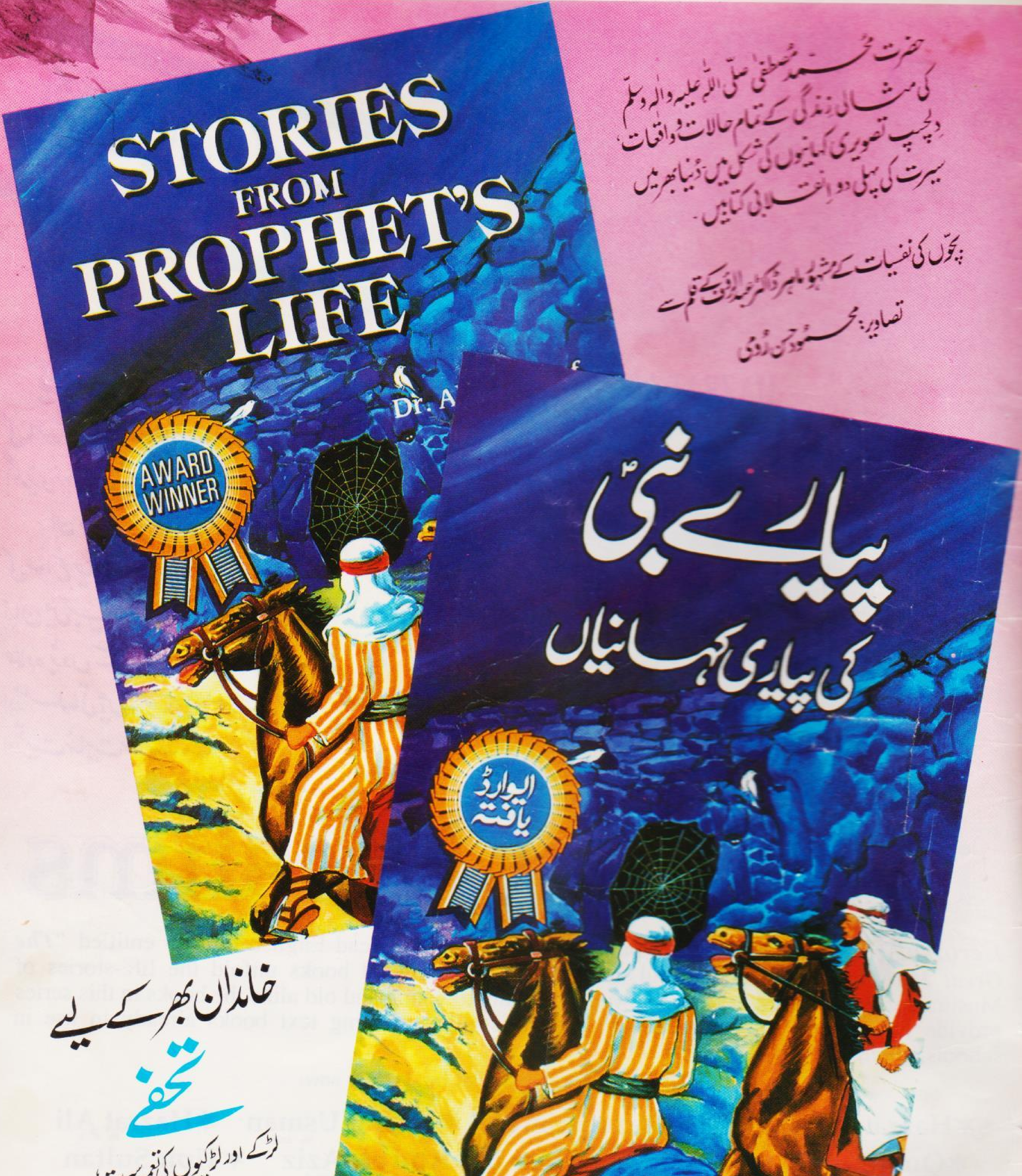


حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم
کی مثالی زندگی کے تمام حالات و واقعات،
دلچسپ تصویری کہانیوں کی شکل میں۔ دُنیا بھر میں
سیرت کی پہلی دو انقلابی کتابیں۔

بچوں کی نفسیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر عبدالرؤف کے قلم سے
تصاویر: محمود حسن رُومی

خاندان بھر کے لیے
تحفہ
لڑکے اور لڑکیوں کی تعمیر سیرت،
والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کیلئے

| | | |
|---|---|---|
| اُردو ایڈیشن | 40 | روپے |
| انگریزی ایڈیشن | 50 | روپے |

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور ـ کراچی ـ راولپنڈی

R. L. No. 4756

# The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

ISSN 969 0039 9175 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

Price Rs. 9.00

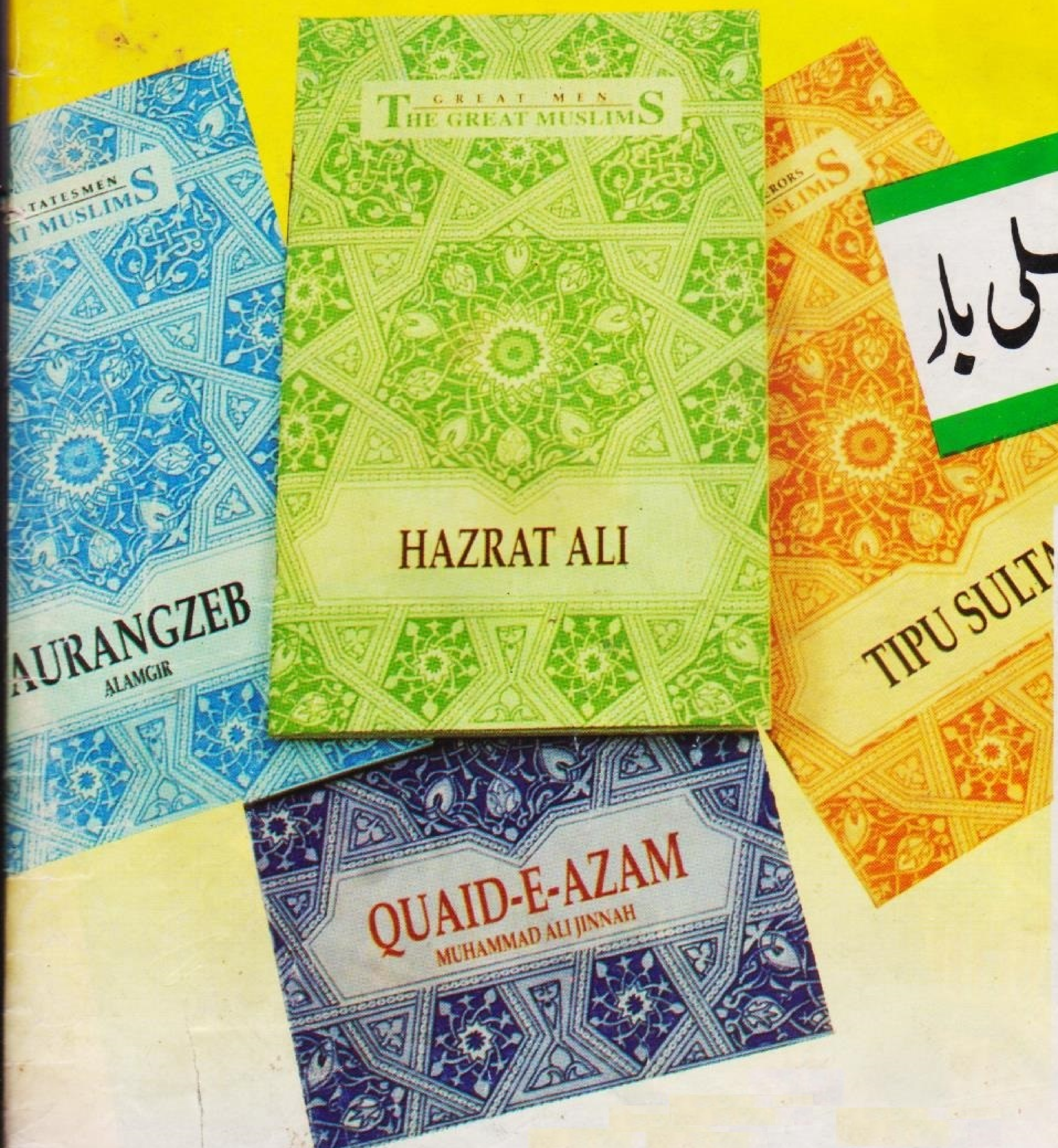


## پاکستان میں پہلی بار

فیروزسنز بچوں کے لیے تاریخِ اسلام کی نامور شخصیات کے حالات زندگی پر مشتمل انگریزی زبان میں کتابوں کی سیریز پیش کرتے ہیں۔ ان دیدہ زیب کتابوں میں نامور مسلمانوں کی سوانح حیات عام فہم اور نہایت آسان زبان میں بیان کی گئی ہے جو بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی یکساں دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ چھپائی کا معیار اعلیٰ اور قیمت نہایت مناسب ہے۔

# The Great Muslims

***Ferozsons*** is proud to present a pioneer series of easy-to-read English books, entitled ***"The Great Muslims"***. These delightful and attractively designed books unfold the life-stories of Muslim heroes in a most captivating way. Appealing to young and old alike, the books in this series provide informative pleasure reading as well as supplementing text books already in use in schools. *Quality books at a nominal price!*

The following books in this series are available now:

- ★Hazrat Abu Bakr Rs. 30.00
- ★Hazrat Umer Rs. 30.00
- ★Hazrat Usman Rs. 30.00
- ★Hazrat Ali Rs. 30.00
- ★Quaid-e-Azam Rs. 45.00
- ★Hazrat Umar bin Abd al- Aziz Rs. 40.00
- ★Tipu Sultan Rs. 30.00
- ★Aurangzeb Alamgir Rs. 30.00

**فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ**

لاہور - راولپنڈی - کراچی

**سندھ اور بلوچستان** پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ - کراچی فون: 570527 570534-537730

**پنجاب** 60 شاہراہ قائداعظمؒ - لاہور 301196-98

**صوبہ سرحد، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے** 277 پشاور روڈ - راولپنڈی 63503-64273